ہندوستانی ادب کے معمار
साहित्य
سید مسعود حسن رضوی ادیب
انیس اشفاق

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

سید مسعود حسن رضوی ادیب

ہندوستانی ادب کے معمار

سید مسعود حسن رضوی ادیب

انیس اشفاق

ساہتیہ اکادمی

Syed Masood Hasan Rizvi 'Adeeb' : A monograph in Urdu by Anis Ashfaq on the Urdu author. Sahitya Akademi, New Delhi (2005), Rs. 25

پہلا ایڈیشن : 2005

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110 001

سیلس آفس : 'سواتی'، مندر مارگ، نئی دہلی 110 001

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بھون، 23 اے/44 ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا 700 053

172، ممبئی مراٹھی سنگھرالے مارگ، دادر، ممبئی 400 014

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور 560 001

مین بلڈنگ، گونا بلڈنگس (دوسری منزل)، (304) 443، انا سلائی، تینم پیٹ، چینئی 600018

قیمت : 25 روپے

ISBN 81-260-1934-4

Website : http://www.sahitya-akademi.gov.in

طابع : آر. کے. آفسیٹ پروسیس، دہلی

شاہ میر اور نور یاب کے نام

فہرست

دیباچہ

پروفیسر مسعود حسن رضوی اردو کے بڑے محقق، جید عالم اور بلند پایہ ادیب ہیں۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے جو مختلف اور متنوع موضوعات کو محیط ہے۔ان کی اہم اور گرانقدر تصنیفات کے حدود میں تنقید، تحقیق، تاریخ، مرثیہ، ڈراما، لسانیات وقواعد، بدیع و بیان غرضیکہ علم و ادب سے تعلق رکھنے والا ہر شعبہ شامل ہے۔ مسعود حسن رضوی کی ادبی اور تنقیدی صلاحیتیں مختلف میدانوں میں یکساں طور پر ظاہر ہو رہی تھیں۔ ایک طرف انھوں نے 'ہماری شاعری'' لکھ کر شعری تنقید کے ان اصولوں اور نظریوں سے متعارف کرایا جن پر کسی اور نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ دوسری طرف انھوں نے بعض ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو آگے چل کر انھیں سے مخصوص ہوئے اور جن کی اہمیت و معنویت انھیں کی تحریروں سے نمایاں ہوئی۔ ان موضوعات کی اہمیت کو ان سے قبل کسی اور نے اس طور نہیں سمجھا تھا۔اسی لیے انھوں نے ان موضوعات میں خصوصی دلچسپی لی اور ان سے متعلق نایاب اور قیمتی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلیا۔ اپنے پاس موجود معتبر ماخذوں سے کام لے کر انھوں نے جو تنقیدی اور تحقیقی کام کیا اس کی وجہ سے انھیں ان موضوعات پر سند کا درجہ حاصل ہوگیا۔ان میں رثائیات، انیسیات اور لکھنویات ان کے مخصوص موضوع تھے۔ ان کی تحقیق سے قبل بیشتر رثائی ادب ہماری دسترس سے باہر تھا۔مسعود حسن نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے اردو مرثیے کی تاریخ کو مرتب اور منظم کرنے کا اہم کام انجام دیا اور مرثیے کی تحقیق وتنقید کے نئے جہات سے روشناس کرایا۔ انھوں نے نہ صرف انیس کے اصل مرثیوں کو دریافت کیا بلکہ ان کے متن کی تصحیح کا مشکل ترین کام بھی انجام دیا اور اپنی تنقیدی بصیرت کی بنا پر انیس کی شاعری کے مخصوص اور منفرد پہلوؤں سے

متعارف کرایا۔ اس تعارف سے پہلی بار ہم نے یہ جانا کہ انیس کی شاعری کی دنیا کتنی وسیع ہے اور وہ کن کن معنوی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے نیز یہ بھی جانا کہ فنی اعتبار سے انیس کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔

اودھ کی تاریخ اور لکھنؤ کی تہذیب ہمارے بیشتر مورخین کی دل چسپی کے موضوع رہے ہیں لیکن ان مورخین کی اصل ماخذوں تک رسائی نہ ہونے اور ان کی مصلحت کوش جانبداریوں کی وجہ سے اودھ کی صحیح تاریخ اور لکھنؤ کی اصل تہذیب سے ہم بہت دنوں تک بیگانہ رہے۔ مسعود حسن کی تحقیقی عرق ریزیوں نے غلط روایتوں کے پردے ہٹا کر اودھ کی تاریخ اور لکھنؤ کی تہذیب کے اصل نقوش کو اجاگر کیا۔

ایک اور موضوع ایسا ہے جس کی اہمیت و معنویت سے واقف ہونا ہمارے لیے ممکن نہ تھا اگر مسعود حسن کی تحقیق و تنقید اس راہ میں ہماری رہنمائی نہ کرتی۔ یہ موضوع ہے اردو ڈراما اور اسٹیج، مسعود حسن کے تحقیقات سے قبل ہم نہ تو اردو ڈرامے کی تاریخ سے واقف تھے نہ اسٹیج کی وہ شکل ہمارے سامنے تھی جس نے اس وقت کے لکھے ہوئے ڈراموں کی منظرنمائی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مسعود حسن نے مستند ماخذوں کی بنیاد پر نہ صرف یہ بتایا کہ اردو کا پہلا باضابطہ ڈرامہ کس کا لکھا ہوا ہے بلکہ اصل اور بنیادی حوالوں کی مدد سے یہ بھی بتایا کہ ابتدائی اردو ڈراموں کی پیش کش کے لیے اسٹیج کس طرح آراستہ کیا جاتا تھا اور روشنیوں، رنگوں اور پوشاکوں کے استعمال میں کیا کیا ہنر دکھائے جاتے تھے۔ انھوں نے ہندستانی ڈرامے کی قدیم روایت کے گہرے اور وسیع مطالعے کے بعد اردو ڈراما اور اسٹیج کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے اردو ڈرامے کی تنقید اور تحقیق کے لیے ہمیشہ بنیادی حوالے کی حیثیت حاصل رہے گی۔

میر اور غالب کو اگرچہ مسعود حسن رضوی نے اپنا مستقل موضوع نہیں بنایا لیکن میر و غالب سے متعلق ان کی اہم تحقیقوں اور تعبیروں نے ان شاعروں کی قدرشناسی میں اہم اضافہ کیا ہے۔

مسعود حسن نے اپنی تحقیقی جانفشانیوں کی بدولت بعض ایسے شہ پاروں کو دریافت کیا

جو ادبی اور لسانی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ان شہ پاروں کو مرتب کیا بلکہ ان پر عالمانہ مقدمے لکھ کر ان کی ادبی خوبیوں اور لسانی خصوصیتوں کو نمایاں کیا۔ان شہ پاروں میں فائز اور ان کا کلام مسعود حسن رضوی کا اہم کارنامہ ہے جس سے شمالی ہند کی شروع کی شاعری کے موضوعات و مضامین اور اس شاعری کی لسانی ساخت کا پتہ چلتا ہے۔

مسعود حسن نے لسانیات و قواعد کے میدان میں بھی بنیادی کام کیا۔ انھوں نے پہلی بار اردو اور ہندی کے لسانی مزاج پر عالمانہ بحث کی اور اردو رسم خط کی خصوصیت اور انفرادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور مثالوں کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا کہ اردو کے رسم خط کا بدلا جانا دراصل اس زبان کی موت کے مترادف ہے۔ انھوں نے اردو قواعد کے اصولوں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی اور اس سے متعلق بہت سے نئے نکات کو روشن کیا۔

اس طرح مسعود حسن رضوی نے علم و ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور کم و بیش ہر میدان میں ایک نئی راہ کو دریافت کیا جس پر چل کر دوسروں کو نئی منزلوں کی جستجو کی تحریک ملی۔ ان کے علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں اگر چہ بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ان کی چھوڑی ہوئی تحریروں اور ان کی چھیڑی ہوئی بحثوں میں اب بھی اتنی وسعت ہے کہ ان سے نئے ادبی مسائل کی تعبیر اور نئے ادبی نظریات کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔

•

ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے مسعود حسن رضوی پر ہندو پاک میں کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے لیکن ان میں سب سے عمدہ مقالہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے لکھا ہے۔ اس کتابچہ میں ان کے مقالے سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے۔ اس استفادے کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

معروف افسانہ نگار، محقق اور نقاد پروفیسر نیر مسعود اور ان کے چھوٹے بھائی جناب

اظہر مسعود نے مجھے اپنے والدِ محترم کی تمام کتابیں فراہم کیں۔ میں ان ہر دو حضرات کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے کتابچے کی تکمیل کے بعد اس کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے مشتملات پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اس کے لیے ان کا مزید شکریہ۔

کتابچے کی تصنیف میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مسعود حسن رضوی کی سی مختلف الجہات شخصیت کی تمام حیثیتیں پوری طرح اجاگر ہوجائیں اور پڑھنے والا ان کے بارے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات سے آگاہ ہوجائے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔

انیس اشفاق

سوانح

مسعود حسن رضوی کا تعلق سادات کے ایک قدیم اور خوش حال خاندان سے ہے۔ اس خاندان کے افراد ایران کے شہر نیشاپور سے آ کر ہندستان میں آباد ہو گئے تھے۔ مسعود کے اجداد نے آسودہ حال زندگی گزاری لیکن ان کے والد کے زمانے میں اجداد کی سی خوشحالی نہیں تھی، مسعود کے والد سید مرتضیٰ حسین پیشے سے حکیم اور بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ لکھنؤ کا ایک معروف قصبہ نیوتنی ان کا وطن تھا، لیکن علم کا شوق انھیں لکھنؤ لے آیا اور تلاشِ معاش نے انھیں بہرائچ پہنچادیا اور یہیں 29 جولائی 1893 کو مسعود کی ولادت ہوئی۔ نام محمد مسعود رکھا گیا اور عرفیت ننھے قرار پائی۔

ادیب کے لکھے ہوئے سوانحی حالات کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر ہی پر عمر کے پانچویں سال سے ہوا۔ ان کی عربی فارسی تعلیم کو شروع ہوئے ابھی کچھ ہی زمانہ ہوا تھا کہ اچانک ان کے والد حکیم مرتضیٰ حسین اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے اور بہرائچ کی گھر گرہستی چھوڑ کر نیوتنی منتقل ہو گئے۔ یہاں آ کر ان کی آشفتگی میں اور اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں ان کے یہاں دو بچوں کی ولادت ہوئی۔ ایک بیٹی سیدہ بیگم 1896 میں پیدا ہوئی اور چار سال بعد ایک بیٹے آفاق حسین کی پیدائش (1901) ہوئی۔ اپنی آشفتگی کے عالم میں حکیم مرتضیٰ حسین مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے ایران و عراق کے سفر پر نکل گئے لیکن طبیعت پھر بھی نہ سنبھلی۔ سفر سے واپسی پر چالیس برس کی عمر میں 28 دسمبر 1903 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت محمد مسعود کی عمر دس سال تھی۔

حکیم سید مرتضیٰ حسین کوئی اثاثہ پس انداز کے بغیر اس دنیا سے اٹھ گئے تھے اس لیے ان کے انتقال کے بعد مسعود کو سخت مشکلوں کا سامنا تھا۔ مسعود نے خود لکھا ہے:

"والد کے انتقال کے بعد چاروں طرف اندھیرا تھا۔ عزیزوں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ میرے تعلیمی مصارف کا بار اٹھاتا۔ مالی اعانت کا کیا ذکر، خالی مشورہ بھی کسی سے نہ مل سکا۔"(1)

مسعود کی والدہ ایک باہمت خاتون تھیں۔ انھوں نے ثابت قدمی سے ان نامساعد حالات کا مقابلہ کیا اور کسی سے کوئی امداد قبول نہ کی۔ نیوتنی میں مسعود حسن رضوی کچھ دن تک اردو پرائمری اسکول میں باضابطہ داخلے کے بغیر پڑھتے رہے۔ یہاں انھوں نے صدرِ اعلیٰ مولوی محمد حسن سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کے سلسلے کو باقاعدگی سے جاری رکھنے کے لیے وہ اپنی نانی کے پاس اناؤ بھیج دیے گئے، جہاں انھوں نے اس زمانے کے ایک لائق اور مشہور استاد چودھری محمد ماہ سے بھی درس لیا۔ اناؤ ہی میں مسعود کی نانی کے بھائی میر عبدالعلی نے انھیں حساب سکھایا اور مرثیہ خوانی کی بھی تعلیم دی۔ شاید اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر مسعود کو مرثیے سے خصوصی دل چسپی پیدا ہوگئی۔ آگے کی تعلیم مسعود اناؤ میں حاصل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اسکول میں داخلے کے لیے یہاں انگریزی کی واقفیت لازمی تھی۔ اس لیے ان کا نام اناؤ سے تین میل کے فاصلے پر 'کرون' نام کے گاؤں میں واقع اَپر پرائمری اسکول کے چوتھے درجے میں لکھوا دیا گیا۔ اس دوران اناؤ میں ورنا کیولر اسکول قائم ہو چکا تھا، مزید تعلیم کے لیے مسعود کو اس اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں سے انھوں نے پانچویں اور چھٹے کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے۔ اگلے درجوں کی تعلیم کے لیے ضروری تھا کہ مسعود اناؤ سے نکل کر لکھنؤ جائیں لیکن مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا۔ اس بار پھر ان کی والدہ ہاشمی بیگم نے ہمت سے کام لیا اور ناسازگار حالات کے باوجود اپنے بیٹے کی اچھی تعلیم کے لیے مسعود کو لکھنؤ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مسعود اپنی نانی کے بھائی میر عبدالعلی کے ساتھ لکھنؤ آ گئے جہاں حسین آباد ہائی اسکول میں ان کا داخلہ ہوا۔ یہاں انھیں پانچ سال تک اس لیے رہنا پڑا کہ اس وقت کے ضابطوں کے مطابق انھیں ہائی اسکول پاس کرنے کے لیے وہ امتحان پھر

1 مصنف کی آپ بیتی۔ مشمولہ ہماری شاعری۔ طبع دوازدہم 1974 ص 261

سے پاس کرنا پڑے جنھیں وہ پاس کر چکے تھے۔ مسعود حسن رضوی نے تقریباً 18 سال کی عمر میں حسین آباد ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت انھیں جو سرٹیفکیٹ دیا گیا اس میں ان کا نام محمد مسعود کے بجائے سید مسعود حسن لکھا ہوا ہے۔ نام کی اس تبدیلی کے بارے میں ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں:

> ''دراصل ان کو اپنا نام شروع ہی سے ناپسند تھا۔ ان کے والد، چچا اور دوسرے بزرگوں کے نام 'حسن' یا 'حسین' پر تھے۔ ان ناموں کے بیچ محمد مسعود انھیں بے جوڑ لگتا تھا۔ اس پر وہ کئی بار ماں سے الجھ چکے تھے کہ ان کا نام محمد مسعود کیوں رکھا گیا۔ آخر کار انھوں نے اپنا نام بدل ہی لیا اور ہائی اسکول کا امتحان اسی نام سے دیا۔''[2]

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مسعود کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ آگے کی تعلیم جاری رکھ سکیں اس لیے انھوں نے نوکری کا ارادہ کرلیا۔ لیکن ان کی ماں ہاشمی بیگم کو یہ گوارا نہ ہوا۔ وہ مسعود کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتی تھیں اس لیے انھیں کیننگ کالج، لکھنؤ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ دلوایا گیا اور مسعود کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگے۔ یہاں مشہور افسانہ نگار علی عباس حسینی پہلے سے موجود تھے۔ مسعود نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان 1915 میں پاس کیا اور پھر اسی کالج میں بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے کے ضابطوں کے مطابق لکھنؤ میں بی۔اے میں داخلہ لینے والے طالب علم کو اسی درجے کا امتحان الہ آباد سے پاس کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مسعود نے بھی انگریزی، فلسفہ اور فارسی کے مضمونوں کے ساتھ 1917 میں بی۔اے کا امتحان الہ آباد سے پاس کیا۔ 1922 میں انھوں نے ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد سے ایل۔ٹی کی سند حاصل کی اور 1925 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر انھیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ اس وقت ان کی عمر 32 سال تھی۔

---

2 مسعود حسن رضوی ادیب۔ ذات وصفات، مرتبہ مالک رام، ص 53

مسعود کی اس نمایاں کامیابی اور اس کے بعد کے علمی فتوحات کو دیکھنے کے لیے اُن کو تعلیم کی اعلیٰ منزل تک پہنچانے والی ان کی ماں ہاشمی بیگم موجود نہ تھیں۔ یہ باہمت خاتون مسعود کے ایم۔اے پاس کرنے کے سات سال قبل یعنی 1918 میں انفلوئنزا کے وبائی مرض میں مبتلا ہوکر انتقال کرگئیں۔ ان کی موت بھی مسعود کے لیے ہوئی۔ دراصل انفلوئنزا کے مرض میں پہلے مسعود حسن مبتلا ہوئے اور مسعود کی تیمارداری کرتے کرتے خود ہاشمی بیگم بھی بیمار پڑ گئیں اور ایسی بیمار پڑیں کہ پھر صحت یاب نہ ہوسکیں۔

مسعود حسن رضوی نے تعلیم کی ابتدا ہی سے استادوں پر اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں پانچویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے پ سے ذ تک گیارہ حروف تہجی سے شروع ہونے والے اشعار ایک بیاض کی شکل میں قلم بند کیے تھے۔ اس بیاض میں میر، نظیر، دیاشنکر نسیم، ذوق، غالب، انیس وغیرہ کے علاوہ متعدد نامعلوم شاعر بھی شامل ہیں۔ مسعود حسن رضوی کی یہ اولین تالیف ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود کے بقول ''مفید مطلب اشعار کی تلاش میں یہ انہماک اور مناسب محل پر ان کے استعمال کا سلیقہ ان کی سب سے مشہور تصنیف 'ہماری شاعری' میں بہت کام آیا۔''

ثانوی درجوں میں مسعود کی انگریزی لیاقت کا پتہ اس رپورٹ سے چلتا ہے جو ایک انگریز انسپکٹر آف اسکولز نے اس وقت لکھی تھی جب مسعود آٹھویں جماعت میں تھے اور معائنے کے دوران انھیں ایک اقتباس کا انگریزی ترجمہ کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ رپورٹ یہ ہے:

> "I tested class VIII-B in a piece of unseen translation from Urdu to English...... Only one boy, S.Mohd. Masood showed a really satisfactory command of correct and idiomatic English."(3)

ایک اور رپورٹ اس وقت کی ہے جب طبیعت کی خرابی کے باعث مسعود کا امتحان میں نہ بیٹھنے کا عذر قبول کرتے ہوئے انھیں اگلی جماعت میں ترقی دے دی گئی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے ان کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے لکھا:

3 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر طاہر تونسوی 1989، ص 7

"His record, showing that he secured marks of first division, he is exempted from appearing in the examination and will be noted as passed creditably and promoted to higher class." (4)

کالج کی سطح پر بھی مسعود کی ذہانت اور لیاقت کا شہرہ عام تھا۔ کیننگ کالج، لکھنؤ کے پرنسپل مسٹر کیمرن نے ان کی لیاقت کے اعتراف میں انھیں یہ سند عطا کی:

"He won Caning College scholarship and in every single terminal examination he acquitted himself well in each subject. His success in all, more creditable to him ..... I recommend him as an industrious student usually intelligent and well qualified in his subject of study." (5)

ابتدائی درجوں میں مسعود کی انگریزی کی لیاقت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ بی۔اے کی سطح پر بھی ان کے استاد پروفیسر ی۔ایف۔ براؤن نے ان کی انگریزی کی لیاقت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

"He writes and speaks English fluently and has a very good knowledge of language." (6)

انگریزی ہی کی طرح ان کی فارسی دانی کا اعتراف بھی شروع ہی سے کیا جانے لگا تھا۔ ان کے فارسی کے استاد سید ابوالحسن نے ان کی فارسی کی مہارت کے بارے میں لکھا ہے:

''......اس کی فارسیت کے متعلق صرف یہ کہنا کہ مسلسل پانچ سال تک اپنے کلاس میں اول رہا، اس کی واقعی قابلیت کے اظہار سے صریحاً چشم پوشی ہوگی، جب کہ فارسیت میں اس نے ایک خاص مذاق اور مہارت حاصل کر لی ہو۔ البتہ یہ مجاز ایک حد تک بے حقیقت نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اس نے فارسی کو اپنی زبان بنالیا تھا۔'' (7)

وسائل کی کمی کی وجہ سے مسعود حصولِ تعلیم کے دوران ہی ملازمتوں کی تلاش میں رہنے لگے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں انھیں کم کم وقفوں کے لیے چھوٹی موٹی نوکریاں کرنا

4 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر طاہر تونسوی 1989، ص 7
5 ایضاً، ص 9
6 ایضاً، ص 10
7 ایضاً، ص 8

پڑیں۔ انھیں نوکریوں میں سے ایک نوکری (1918) ایسی بھی تھی جو نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم نہیں تھی لیکن جس میں رہ کر مسعود کے مطالعے کے شوق میں اضافہ ہوا۔ اس ملازمت میں مسعود کا کام یہ تھا کہ صوبے کی تمام چھپی ہوئی کتابوں کی فہرست ضروری تفصیلوں کے ساتھ مرتب کر کے سرکاری گورنمنٹ گزٹ میں شائع کرائیں اور عوام کے خیالات معلوم کرنے کی غرض سے ان کتابوں پر تبصرے لکھ کر اس رپورٹ کے لیے سامان فراہم کریں جو سررشتۂ تعلیم کے ڈائریکٹر کو ہر سال گورنمنٹ کے پاس بھیجنا پڑتی تھی۔ مسعود نے یہاں ساڑھے تین سال تک کام کیا۔ اسی ملازمت کے دوران گورنمنٹ ہائی اسکول، فتح گڑھ میں ان کا تقرر ہوگیا۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جونیر لکچرر کی جگہ نکلی۔ مسعود نے درخواست دی۔ انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ شاعر ہیں تو مسعود نے جواب دیا:

> "اگرچہ میں نے کبھی کبھار ایک آدھ شعر موزوں کر لیا ہے تاہم میں باقاعدہ شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن میرا خیال ہے کہ اردو ادب کے معلم کے لیے اچھا شاعر ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا شاعری کا اچھا نقاد ہونا اور وہ میں ہوں۔"[8]

اس ملازمت کے لیے چونکہ باضابطہ مقررشدہ شرائط نہ تھے اس لیے تین سو کے قریب امیدواروں نے درخواستیں دی تھیں جن میں مولانا عبدالحلیم شرر اور مولانا صفی لکھنوی کے علاوہ لکھنؤ اور بیرونِ جات کے متعدد اساتذۂ فن بھی شامل تھے۔[9]

1922 میں ان متعدد اساتذۂ فن کے مقابلے میں جونیر لکچرر کے عہدے پر مسعود کا تقرر ہوگیا۔ 1928 میں وہ سینیر لکچرر (اردو) کے عہدے پر فائز ہوئے۔ تین سال بعد فارسی کے ریڈر کی جگہ خالی ہوئی اور 1930 میں مسعود کا تقرر اس عہدے پر ہوگیا اور اسی کے ساتھ وہ اردو اور فارسی شعبے کے صدر بھی ہوگئے۔

اپنے زمانے کے بزرگ اور معروف ادیبوں کے مقابلے میں مسعود کے لکھنؤ یونیورسٹی

8 مسعود حسن رضوی ادیب۔ ذات و صفات، مرتبہ مالک رام، ص 65-64

9 ایضاً، ص 72-71

میں لکچرر ہوجانے اور بہت جلد ترقی کر کے ریڈر و صدر شعبہ بن جانے کی وجہ سے محروم امیدواروں نے ان کے خلاف اس وقت کے انگریزی اور اردو کے اخباروں میں مہم شروع کردی۔ مسعود کے خیرخواہوں نے ان مخالفانہ مراسلوں کے مدلل جواب دیے لیکن مسعود حسن رضوی نے خود کو ان تنازعوں سے الگ رکھا اور خاموشی سے شعبے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی محنت، لیاقت اور تدریسی خدمات کے پیش نظر 1945 میں یونیورسٹی کی عاملہ نے انھیں پروفیسر بنائے جانے کی تجویز منظور کی لیکن سیاسی ہنگاموں کے تیز ہوجانے کی وجہ سے اس تجویز پر عمل نہ ہوسکا۔ جب یہ ہنگامے تھمے اور ملک آزاد ہوگیا تو آٹھ سال بعد عاملہ کی 1945 کی تجویز پر عمل کیا گیا اور انھیں مئی 1953 میں پروفیسر کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ 15 جون 1954 کو یعنی اپنی پروفیسری کے ٹھیک ایک سال بعد یونیورسٹی میں بتیس سال استاد کی حیثیت سے کام کرنے اور چوبیس برس اردو فارسی شعبے کے صدر کے خدمات انجام دینے کے بعد مسعود حسن رضوی ساٹھ سال کی عمر میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔

یونیورسٹی کی باقاعدہ ملازمت میں آنے کے چار سال بعد 13 فروری 1926 کو مسعود حسن رضوی کی شادی کانپور کے محلّہ پٹکاپور کے حکیم سید محمد اصغر نعمت اللّٰہی معروف بہ حکیم پیارے صاحب کی صاحبزادی حسن جہاں بیگم عرف حسینہ بیگم کے ساتھ ہوئی۔ حسن جہاں بیگم ہنرمند، خوش اخلاق، باسلیقہ اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ ذہین اور پڑھی لکھی ہونے کے باعث انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ازدواجی زندگی کو پرسکون اور خوش گوار بنائے رکھنے کے لیے کن کن امور کی اہمیت ہے اور کون کون سی مفاہمتیں ضروری ہیں۔ حسن جہاں کے ادبی ذوق اور شاعرانہ شغف نے مسعود سے ان کی ہم مزاجی اور ہم آہنگی کو اور بڑھادیا۔ اپنی ان خصوصیتوں کی بنا پر حسینہ بیگم ذہنی اور خانگی سطح پر مسعود حسن کی زندگی کا ناگزیر حصہ بنی ہوئی تھیں۔ دونوں نے اپنی عمر کے آخری دنوں تک محبت سے معمور ایک مثالی اور قابلِ رشک زندگی گزاری۔

مسعود کی طرح ان کی بیوی بھی انیس کی شیدائی تھیں اور انیس کے پورے کے

پورے مرثیے انھیں زبانی یاد تھے۔ مسعود حسن انیس پر اپنے کاموں کے سلسلے میں مراثی انیس کی ورق گردانی کرنے کے بجائے اپنی بیوی سے رجوع کرتے تھے اور حسینہ بیگم وثوق سے بتا دیتی تھیں کہ کون سا بند انیس کے کس مرثیے میں ہے۔ انھوں نے اردو کی ضرب الامثال بھی جمع کی تھیں لیکن ان کی جمع کی ہوئی یہ کہاوتیں کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکیں۔

ماں اور بیوی دونوں کے معاملے میں مسعود بہت خوش نصیب تھے۔ ماں نے انھیں تعلیم کی اعلیٰ منزل تک پہنچایا اور بیوی نے علمی کاموں کے لیے انھیں وہ خوش گوار ماحول فراہم کیا جس نے مسعود کو ادبی شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ اس نیک طینت اور وفا شعار بیوی نے پینتالیس سال، سات مہینے، بائیس دن اپنے شوہر کے ساتھ بڑی خوش اسلوبی سے گزارے اور 23 اکتوبر 1969 کو رات کے ساڑھے بارہ بجے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئیں۔ دوسرے دن چار بجے سہ پہر کو منشی فضل حسین خاں کی کربلا میں سپردِ خاک کی گئیں۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ اکتوبر ہی کے مہینے میں حسینہ بیگم کی ساس کا بھی انتقال ہوا جو اپنی ہی طرح کے صفات کی حامل اپنی بہو کو نہیں دیکھ سکیں۔

بیوی کے انتقال سے مسعود کو گہرا صدمہ پہنچا۔ اس صدمے کا اظہار انھوں نے اپنی ڈائری کے 23 اکتوبر 1969 کے اندراج میں اس طرح کیا ہے:

> ''آج رات ساڑھے بارہ بجے میری عزیز ترین رفیقۂ حیات کا چھیالیس برس کا ساتھ چھوٹ گیا۔''(10)

اب مسعود اداس اور مضمحل رہنے لگے۔ اس جانکاہ سانحے نے انھیں کمزور کر دیا۔ اسی دوران ان کے بڑے داماد ڈاکٹر مسیح الزماں بھی داغ مفارقت (8 فروری 1975) دے گئے۔ مسعود میں ان غموں کو انگیز کرنے کی طاقت نہیں رہی۔ بالآخر وہ صاحب فراش ہو گئے اور چار مہینے بستر سے لگے رہنے کے بعد 29 نومبر 1975 کو پونے نو بجے شب میں انتہائی تکلیف کے عالم میں انھوں نے آخری سانس لی۔ دوسرے دن تیس نومبر کو اپنی بیگم کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ مسلمانوں کے دونوں فرقوں نے مولانا علی نقی اور مولانا ہاشم میاں

10 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص 27

فرنگی محلی کی اقتدا میں الگ الگ نمازِ جنازہ ادا کی۔

اخباروں اور رسالوں میں ان کے انتقال پر تفصیلی خبریں شائع ہوئیں اور گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔

کامیاب ازدواجی زندگی میں مسعود حسن کے یہاں سات اولادیں پیدا ہوئیں۔ پیدائش کے اعتبار سے ان کے نام اس طرح ہیں:

(1) ارجمند بانو بیگم — ولادت 28 نومبر 1927 شوہر ڈاکٹر مسیح الزماں
انتقال: 21 فروری 1994

(2) اختر مسعود رضوی — ولادت: 25 جولائی 1929، لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کیا۔ پشاور یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر رہے۔
انتقال: یکم جون 1996

(3) برجیس بانو — ولادت: 13 ستمبر 1931 ترکِ سکونت کے بعد کراچی میں مقیم ہیں۔

(4) انیس بانو — ولادت: 30 مارچ 1933 انجینیر شوہر کے ساتھ کیلی فورنیا میں مقیم ہیں۔

(5) پروفیسر نیر مسعود — ولادت: 16 نومبر 1934 محقق، نقاد، افسانہ نگار، ماہر انیسیات

(6) ڈاکٹر انور مسعود — ولادت: 5 جولائی 1937، ہومیو پیتھک ڈاکٹر۔ موہن ہومیو پیتھک کالج، لکھنؤ سے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

(7) اظہر مسعود — ولادت: 31 دسمبر 1942، لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔ اتر پردیش اردو اکادمی سے ریسرچ آفسر کے عہدے سے سے ریٹائر ہوئے۔

●

وضع قطع کے اعتبار سے مسعود حسن قبول صورت اور درازقد تھے۔ بدن چھریرا اور رنگ گندمی تھا۔ شخصیت میں رکھ رکھاؤ تھا۔ طبیعت سے میل نہ کھانے والے لوگوں سے جلدی گھلتے ملتے نہیں تھے لیکن ہم مزاج لوگوں سے خوب کھل کر اور دیر تک گفتگو کرتے۔ لکھنوی تہذیب و نفاست ان کی شخصیت میں رچی ہوئی تھی۔ لہجہ متین اور متوازن، آواز بلند، گفتگو شائستہ اور انداز دل نشیں تھا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ بات وضاحت اور صراحت کے ساتھ یوں کرتے کہ سارے پیچ کھل جاتے۔ تقریر کا یہی وصف ان کی تحریر میں بھی ہے۔ تلفظ، لہجے کے اتار چڑھاؤ اور جملے کی فطری ترتیب کا خاص خیال رکھتے۔ حافظہ غیرمعمولی تھا اور اپنی تحریروں کے صفحوں کے صفحے زبانی یاد تھے۔ طبیعت میں ظرافت اور شگفتگی تھی جس کے مظاہرے اکثر موقعوں پر ہوا کرتے۔ پوشاک اچھی پہنتے تھے اور موسم، وقت اور موقع کی مناسبت کا خیال رکھتے۔ سوٹ اور شیروانی ان کے پسندیدہ لباس تھے لیکن ان کے پہنے جانے کے محل اور اوقات مختلف تھے۔ پوشاک کے ساتھ ساتھ خوراک اور طرز رہائش کے معاملے میں بھی خوش ذوقی کا ثبوت دیتے۔ مسعود کے قریبی دوست مرزا محمد عسکری ان کی ان خصوصیتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آپ تمدن کے عناصر ثلثہ یعنی خوراک، پوشاک اور مکان کے بہترین برتنے والے ہیں۔کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں، کپڑا اچھے سے اچھا اور نہایت عمدہ سلا ہوا پہنتے ہیں...آپ کا مکان دین دیال روڈ پر عرش سے فرش تک یعنی چھت سے زمین تک آپ کی جودتِ طبع اور خوش مذاقی کا بہترین ثبوت ہے۔''(11)

مسعود کشادہ ذہن اور بے تعصب شخص تھے۔ روادار ہونے کے باوجود اپنے عقائد پر سختی سے کاربند تھے اور اس میں کسی طرح کی مفاہمت کے قائل نہیں تھے۔ مذہبی بحثوں میں کبھی نہیں الجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زبان سے کبھی کوئی ایسا فقرہ نہیں نکالا جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔

مسعود حسن رضوی نے ایران اور عراق کا سفر بھی کیا اور اپنے تین ماہ کے سفر کی

---

11 من کیستم، مرزا محمد عسکری، ص 71

مختصر تفصیلیں بھی قلم بند کیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد ان کے سفر کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''مسعود حسن رضوی کے سفر ایران کے دو تین مقاصد تھے۔اول وہ اس ملک کو جس کی تاریخ و تہذیب کا ایک مدت سے درس دے رہے تھے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسرا مقصد دور حاضر کی فارسی زبان کے بارے میں معلومات فراہم کرنا چاہتے تھے۔ تیسرا مقصد قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی تلاش تھا۔''(12)

اس سفر کے دوران مسعود نے مقدس مقامات کی زیارتیں بھی کیں۔

مسعود حسن نے جس زمانے میں آنکھ کھولی، ادبی اعتبار سے وہ انتہائی اہم زمانہ تھا۔ مسعود کے جوان ہوتے ہوتے اور تصنیف و تالیف کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کے عہد میں کئی عہد ساز اور نامور ادبی ہستیاں وجود میں آچکی تھیں۔ ان میں اقبال، مرزا محمد ہادی رسوا، جوش ملیح آبادی، عبدالحلیم شرر، یگانہ چنگیزی، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر عابد حسین، نصیرالدین ہاشمی، دتاتریہ کیفی، حسرت موہانی، تاجور نجیب آبادی، عبدالقادر سروری اور حامد حسن قادری وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اسی زمانے میں لکھنؤ میں بھی یادگار زمانہ شخصیتیں موجود تھیں۔ جن میں مرزا محمد عسکری، آرزو لکھنوی، برج نرائن چکبست، یگانہ چنگیزی، کشن پرشاد کول، علی عباس حسینی، عبدالماجد دریابادی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور اثر لکھنوی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ یہ سب مسعود کے ہم عہد یا قریب العہد ادیب تھے۔ مقامی ادیبوں میں سے تو بیشتر کا مسعود کے یہاں روز کا آنا جانا تھا۔ کچھ ان کے ہم مکتب و ہم جماعت تھے۔ بعض سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے اور کچھ سے مسعود کی مستقل خط و کتابت تھی۔

مسعود حسن رضوی کو کتابیں پڑھنے اور اسی کے ساتھ ساتھ کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے ان کا کتب خانہ نادرونایاب کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ زبان و ادب پر تحقیق کرنے والے ادیب اور طلبہ ملک کے کونے کونے سے آکر اس

---

12 مسعود حسن رضوی ادیب۔ ذات و صفات، مرتبہ مالک رام، ص 84

کتب خانے میں موجود کتابوں سے استفادہ کرتے۔

•

مسعود حسن رضوی کو ان کے ادبی اور تحقیقی کارناموں کے لیے ملک کے معروف ادبی اداروں نے کئی اہم انعامات واعزازات سے نوازا:

(1) اتر پردیش کی حکومت نے درج ذیل کتابوں پر ایک ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔
لکھنؤ کا شاہی اسٹیج
لکھنؤ کا عوامی اسٹیج
رزم نامۂ انیس

(2) 1960 میں ان کی کتاب 'اردو ڈراما اور اسٹیج' کو ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا۔

(3) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے یکم اگست 1963 سے 31 جولائی 1966 تک لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ریسرچ پروفیسر کی تقرری۔

(4) فارسی کی مسلّمہ لیاقت اور علمی شغف کے لیے حکومت ہند کا پریسیڈنٹ ایوارڈ، 1969۔

(5) 1970 میں پدم شری کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

(6) مجموعی ادبی خدمات کے صلے میں حکومت اتر پردیش کا پانچ ہزار روپے کا انعام۔

(7) اسلاف میر انیس کے لیے یو پی اردو اکاڈمی کا انعام، 1972۔

○

تنقید

مسعود حسن رضوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کے ربع اوّل میں کیا۔ کہا جاچکا ہے کہ اس وقت شعروادب کی دنیا میں انتہائی اہم اور بلند پایہ شخصیتیں موجود تھیں۔ ان بڑے ناموں کی شہرتوں کے درمیان مسعود نے اپنا قلم سنبھالا اور نئے میدانوں کے ساتھ ساتھ ان میدانوں میں بھی قدم رکھا جن میں اگلے اپنے قدم رکھ چکے تھے۔ مسعود حسن رضوی جانتے تھے کہ ابھی ان میدانوں میں ایسا بہت کچھ ہے جس کی تلاش و تحقیق ضروری ہے اور جو کچھ سامنے آچکا ہے اس پر دوبارہ نظر ڈال کر اسے اور وسعت دی جاسکتی ہے۔ ایک طرف انھوں نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن پر کسی اور نے خامہ فرسائی نہیں کی تھی اور جو ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ دوسری طرف انھوں نے پرانے موضوعات پر قلم اٹھا کر ان میں نئے رخ اور نئے زاویے پیدا کیے۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے جو رثائیات، لکھنویات، انیسیات، ڈراما اور میریات و غالبیات کے سے مختلف اور متنوع موضوعات کو محیط ہے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت انھوں نے نہ صرف تحقیق و تدوین کا صحیح معیار قائم کیا بلکہ اپنے عالمانہ مقدموں، دیباچوں اور حاشیوں کے ذریعے زیرِ تحقیق ادب پاروں کی متن شناسی اور قدر سنجی کا حق بھی ادا کیا۔ تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تفہیم شعر اور تنقید شعر کی روایت پر بھی نگاہ ڈالی۔ قدیم شاعری کے وسیع مطالعے نے مسعود حسن میں شعر فہمی کا شعور پیدا کردیا تھا اور وہ شاعری کے رموز و نکات کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ شاعری کی روایت اور شعر کے مسائل پر لکھی جانے والی اس وقت کی واحد کتاب 'مقدمۂ شعر وشاعری' جب ان کے مطالعے میں آئی تو انھوں نے اس کتاب کے

مسائل و مباحث کو تشنہ جانا اور محسوس کیا کہ ہماری شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ اسی مقصد کے ماتحت انھوں نے اپنی سب سے زیادہ مشہور کتاب 'ہماری شاعری' لکھنا شروع کی۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد اور سبب کتاب کے دیباچے میں انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ایک طرف مغربی تنقید کی کورانہ تقلید نے ہم کو مشرقی مذاقِ شاعری سے بیگانہ کردیا، دوسری طرف خواجہ حالی کی اصلاحی تحریک نے قدیم اردو شاعری کے خلاف بدظنی کی فضا پیدا کردی۔ انھوں نے اردو شاعری کی اصلاح کی غرض سے اپنے دیوان کا جو معرکہ آرا مقدمہ شعروشاعری کے عنوان سے لکھا وہ اردو شاعری پر ایک عالمانہ تبصرہ ہے۔ اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری کے نقائص دکھائے جائیں اور ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی جائیں۔ اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے اردو شاعری کے اس حصے کو نمایاں کیا ہے جو ان کی رائے میں اصلاح کا محتاج تھا اور اس حصے سے عمداً چشم پوشی کی ہے جو ان کے نزدیک بھی اصلاح سے مستغنی اور تعریف کا مستحق تھا، کیونکہ وہ اُن کے موضوعِ بحث سے خارج تھا۔

اس مقدمے نے جہاں اردو شاعروں کو اس پر آمادہ کیا کہ پرانے فرسودہ راستوں کو چھوڑ کے شاعری کے لیے نئی نئی راہیں نکالیں، وہاں ہماری شاعری کی یک رخی تصویر پیش کرکے یہ غلط فہمی بھی پھیلا دی کہ ہمارے قدیم شاعروں کے دیوان جھوٹ کے پوٹ اور تصنع کے دفتر ہیں۔ سچی شاعری اور فطرت کی مصوری سے ان کو کچھ لگاؤ نہیں...

حالی کی بے لوث شخصیت کا وقار اور ان کی نیت کے خلوص کا اعتبار قائم ہو ہی چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا مقدمہ اور مسدس پڑھ پڑھ کر بہت سے لوگ اساتذۂ سخن کی سحرکاریوں اور معجزنگاریوں کو ہذیان اور خرافات سمجھنے لگے اور قابلِ اعتراض کلام کے ساتھ مایۂ ناز کلام بھی بدظنی اور بدبینی کا شکار ہوگیا۔ اب نئے تعلیم یافتہ طبقے کا یہ حال تھا کہ کوئی شعر کو بے کار چیز اور شاعری کو بیکاری کا مشغلہ سمجھنے لگا، کوئی شعر اور غیر شعر میں امتیاز کرنے سے قاصر ہوگیا، کوئی اردو شاعری کو اعتراضوں کا نشانہ بنانے لگا۔

یہی وہ حالات تھے جو اس کتاب کی تصنیف کے محرک ہوئے۔ شعر کا صحیح ذوق، سخن فہمی کا ملکہ اور نقدِ شعر کی قوت پیدا کرنا اور اردو شاعری کا روشن رخ نمایاں کر کے تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہوں میں اس کا وقار قائم کرنا اس تصنیف کے اہم مقاصد ہیں۔''(1)

یعنی مسعود حسن رضوی نے یہ کتاب ایک طرف ان موضوعات کا احاطہ کرنے کی غرض سے لکھی جو حالی کے مباحث کی وضاحت میں ان کے دائرۂ بحث میں آنے سے رہ گئے تھے اور دوسری طرف اس کتاب سے ان موضوعات کا محاکمہ مقصود تھا جنھیں حالی نے عمداً اپنے مباحث سے اس لیے الگ رکھا کہ وہ ان کی فکر سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ پہلی صورت میں ہماری شاعری نے ان منفی نتائج کے استنباط پر سوالیہ نشان قائم کیا جنھیں حالی نے قابلِ قبول دلیلوں کے بغیر اخذ کر لیا تھا اور دوسری صورت میں اس کتاب نے ان موضوعات کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کیا جنھیں حالی نے اپنی مخصوص فکر کی بنا پر فضول اور غیر اہم سمجھ لیا تھا۔ شاعری کی اصلاح کی غرض سے اردو شاعری کے منفی رخ کو دکھاتے دکھاتے حالی یہ بھول گئے کہ ہمارا وقیع اور کثیر شعری سرمایہ جس میں غزلیہ شاعری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، کن کن معنوی موضوعات کو محیط ہے۔ شاعری کو نئے زمانے سے ہم آہنگ کرنے کے لئے وہ ایسی شعریات کو وضع کر رہے تھے جس میں غزلیہ شاعری ان کے خاص نشانے پر تھی۔ حالی کے نقطۂ نظر کا تقاضا یہ تھا کہ وہ شاعری کی نمائندہ اور مقبول ترین صنف غزل کو عشقیہ موضوعات کی ترجمانی کی بنا پر مطعون قرار دیں۔ اس مخصوص نقطۂ نظر کی پرجوش وکالت کی وجہ سے طے شدہ نتائج تک پہنچنے کے لیے حالی نے ادبی نقطۂ نظر کو نظر انداز کر دیا۔ ان کے اخلاقی موقف کی سخت گیری نے ہماری قدیم شاعری کے محاسن کو معرضِ اشتباہ میں ڈال دیا جس کا نقصان یہ ہوا کہ ہم اپنی شاعری کے اہم ترین سرمائے کی ادبی شناخت سے محروم ہو گئے۔ مسعود حسن رضوی نے 'ہماری شاعری' میں اسی سرمائے کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اس طرح حالی کی نگاہ میں ہیچ اور لایعنی ٹھہرنے والے

1 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبع دوازدہم 1974، ص 22-21-20

مباحث مسعود حسن رضوی کی مدلل اور خیال افروز گفتگو کا موضوع بن کر ازخود بامعنی ہوگئے۔ شعروادب کی نئی راہداریوں سے واقف کرانے کے باوجود حالی اپنی پراگندہ فکر کی بنا پر نہ تو اپنے مباحث کی شیرازہ بندی کرسکے اور نہ اپنے موقف کی معقولیت کے قابلِ قبول جواز فراہم کرسکے۔ مخصوص نقطۂ نظر کے ماتحت ہی سہی، لیکن شاعری کی ماہیت و حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی پہلی کوشش نے مقدمہ شعروشاعری کو زمانی سبقت کے ساتھ ساتھ غیرمعمولی شہرت بھی عطا کی۔ اس شہرت کے شور میں بہت زمانے تک ہم اپنی شاعری کے ان موضوعات ومسائل کی طرف متوجہ نہیں ہوسکے جنھیں سمجھے بغیر ہم غزلیہ شاعری کی اہمیت سے واقف نہیں ہوسکتے تھے۔ مسعود حسن رضوی نے انھیں موضوعات ومسائل پر قلم اٹھایا اور شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری کا ازسرِنو جائزہ لے کر 'ہماری شاعری' کی شکل میں ایک نئی شعریات تحریر کی جس نے غزل کی تعبیرنو کا عمل انجام دیا اور اُن غلط فہمیوں کو دور کیا جو مقدمے کے مباحث کی وجہ سے راہ پاگئی تھیں۔ مسعود حسن رضوی نے ہماری شاعری کے دیباچے میں اگرچہ یہ اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب میں ''حالی کی رایوں سے اختلاف کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ جو کچھ انھوں نے چھوڑ دیا تھا اسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی ہماری شاعری خواجہ حالی کی شعروشاعری کا جواب نہیں بلکہ اس کا تتمہ ہے۔'' لیکن مسعود حسن کے اس عاجزانہ اعتراف کے باوجود ہماری شاعری کو مقدمے کا جواب ہی سمجھنا چاہیے، درآں حالیکہ یہ جواب براہِ راست نہیں ہے۔ مسعود حسن رضوی نے حالی کے سخت ترین نقاد کلیم الدین احمد کے جارحانہ انداز کے برخلاف متوازن لب ولہجے میں دلیلوں اور مثالوں کے ساتھ اس شاعری کی اہمیت کو تسلیم کرایا جو مقدمے کے مباحث میں پوری طرح شامل نہیں تھی۔

'ہماری شاعری' میں مباحث کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہٗ اوّل میں شاعری کے معیار پر گفتگو کی گئی ہے اور دوسرا حصہ شاعری کے مسائل سے متعلق ہے۔ پہلے حصے میں جذبات کی اہمیت، شعر کی افادیت، شعر کی حقیقت اور ہیئت نیز شعر کی لفظی اور معنوی خوبیوں پر گفتگو کرتے ہوئے شعر کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے۔

ان پہلوؤں میں شعر میں جذبے کا عمل، شعر کی افادیت، شعر کی عروضی اور منطقی تعریف، موزونیت کی تعریف، شعر کے اثر میں ردیف اور قافیے کا دخل، شاعری میں اصلیت اور اس کا مفہوم اور بدیع و بیان کے رموز شامل ہیں۔ مسائل سے متعلق دوسرے حصے میں شاعری کی وسعت، شاعری میں مقامیت، شاعری کے تقلیدی اور غیرفطری پہلو، شاعری میں معشوق کی جنس، شاعری کے موضوعات ومسلّمات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ مختلف عنوانات کے ماتحت معیار ومسائل کی یہ گفتگو پوری کتاب میں تقریباً ایک سو چالیس شقوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح اس کتاب نے اپنے مباحث کے دائرے میں شاعری کے ہر پہلو کو سمیٹ لیا ہے۔ 'ہماری شاعری' کے مطالعے کے بعد ہم اپنی شاعری کی نوعیت و اہمیت اور حقیقت و ماہیت سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں۔

مسعود حسن رضوی نے اس کتاب میں مباحث کی ترتیب اور شقوں کی تنظیم بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔ گفتگو کا یہ مرتب خاکہ شاعری کے ہر پہلو اور ہر نکتے کو روشن کردیتا ہے۔ 'مقدمۂ شعروشاعری' کا بیشتر حصہ نظری بحثوں پر مشتمل ہے لیکن 'ہماری شاعری' میں ہر مبحث کو مناسب ترین مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا اطلاق کن کن صورتوں پر کس کس طرح ہوتا ہے۔ یوں 'ہماری شاعری' عملی تنقید کا عمدہ نمونہ بن گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسعود حسن نے شاعری کے سنجیدہ قاری کے ذوق اور تجسس کو نگاہ میں رکھ کر اپنے مباحث کا خاکہ ترتیب دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی نظر میں یہ نکتہ بھی ہے کہ مباحث کی مرحلہ وار گفتگو کے ذریعہ شاعری سے متعلق وضاحت طلب نکات کی وضاحت کیوں کر کی جاسکتی ہے۔

'ہماری شاعری' کا دیباچہ اس کے مباحث کا اشاریہ ہے۔ اس دیباچے میں کتاب کی غرضِ تصنیف اور مقصدِ اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے مباحث کے تعارف کے ضمن میں ان اہم نکتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو کتاب کا خاص اور مرکزی موضوع ہیں اور جن پر گفتگو کے ذریعے شاعری کے اس رخ کو روشن کیا گیا ہے جو بقول مصنف مقدمے کے موضوع سے خارج تھا۔

کتاب کے پہلے حصے یعنی 'معیار' کے ذیل میں آنے والے مباحث کی ابتدائی گفتگو میں مصنف نے جذبات کی اہمیت اور شعر کی افادیت کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قوتِ متخیلہ کی ترقی اور جذبات کی تربیت کا شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ آگے چل کر وہ حالی کی طرح شاعری کو نرے اخلاق کی نمائندہ بتانے کے بجائے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> "انسانی اخلاق کی تکمیل کے لیے شعروشاعری کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر اس حقیقت کا اقرار بھی ضروری ہے کہ جو شاعری بعض مخصوص جذبات کو ابھارے اور باقی کو دبائے اس کا اثر اخلاق پر کچھ اچھا نہ ہوگا۔ تمام انسانی جذبوں کو متحرک رکھنا چاہیے تاکہ پیکرِ جذبات کی نشوونما تناسبِ اعضا کے ساتھ ہو۔"[2]

مسعود حسن رضوی حالی کی طرح شاعری کے مقصدی اور افادی پہلو کے قائل تو ہیں لیکن وہ شاعری میں ان جذبات کی ترجمانی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں جو حالی کی مخصوص اخلاقیات کے منافی ہیں۔ اسی باب کے دوسرے مبحث یعنی شعر کی حقیقت اور ماہیت پر گفتگو کرتے ہوئے مسعود حسن نے ایک ایسے نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے جو نثری نظم کی تعریف متعین کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ کامل شعر کی تعریف یا شعر کی کامل تعریف کے ضمن میں شعر کی عروضی اور منطقی تعریفوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "شعر کی منطقی اور عروضی تعریفوں کا انداز خود بتاتا ہے کہ منطق نے نفسِ شعر سے بحث کی ہے اور عروض نے صورتِ شعر سے۔ لہٰذا جو کلام شعر کی منطقی تعریف پر ٹھیک اترے مگر عروضی تعریف کے مطابق نہ ہو، اس پر شعر کا اطلاق اس کلام سے زیادہ صحیح ہے جو شعر کی عروضی تعریف پر ٹھیک اترے مگر منطقی تعریف کے مطابق نہ ہو۔ یعنی موزوں اور بے اثر کلام کے مقابلے میں ناموزوں اور بااثر کلام کو شعر کہنا زیادہ صحیح ہے۔"[3]

---

2 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبع دوازدہم 1974، ص 39-38

3 ایضاً ص 41

یہاں مسعود حسن رضوی نے شعر کی جامع اور مانع تعریف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس فقرے سے نثری نظم کی مشکل آسان کردی ہے :

''لہٰذا جو کلام شعر کی منطقی تعریف پر ٹھیک اترے، مگر عروضی تعریف کے مطابق نہ ہو، اس پر شعر کا اطلاق اس کلام سے زیادہ صحیح ہے جو شعر کی عروضی تعریف پر ٹھیک اترے مگر منطقی تعریف کے مطابق نہ ہو۔''(4)

حالی نے بھی وزن کو شعر کے لیے ضروری نہیں قرار دیا ہے لیکن وہ ایسی تعریف وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو وزن سے عاری کلام کو شاعری کے زمرے میں لا سکے۔ آج ہم نثری نظم کو شاعری کی صف میں شمار کرنے کے لیے طرح طرح کی تعریفیں وضع کر رہے ہیں لیکن نثری نظم کے کسی نقاد نے نثری نظم کی تعریف وضع کرنے کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی کے اس فقرے کی طرف توجہ نہیں کی۔

شعر میں اثر کے اضافے کے لیے مسعود حسن موزونیت کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ انکشاف بھی کرتے ہیں :

''اگرچہ وزنوں کے نام اور پیمانے عروض کی کتابوں میں دیے ہوئے ہیں لیکن اصولِ موزونیت کے ماتحت شعر کے نئے اوزان دریافت کرنے کا امکان اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔''(5)

مسعود حسن رضوی کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور نئے اوزان کو دریافت کرنے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسی باب میں مسعود حسن نے ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیے کی پابندی شاعر کے خیال کو پوری طرح منتقل نہیں ہونے دیتی۔ اس ضمن میں مسعود حسن کا کہنا ہے :

''اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ غزل میں شاعر کا ذہن قافیے سے مضمون کی طرف جاتا ہے تو بھی کیا قباحت ہے۔ ایک ایک لفظ انسان کے ذہن کو بے شمار خیالوں کی طرف منتقل کرسکتا ہے... قافیہ جن خیالوں کی طرف شاعر کے

---

4 ہماری شاعری : مسعود حسن رضوی ادیب : طبع دوازدہم 1974، ص 14

5 ایضاً ص 42

ذہن کو منتقل کردے گا، ان میں سے جس خیال کو وہ نظم کردے وہ اسی کا خیال ہوگا۔ اس صورت میں یہ قول کیوں کر صحیح ٹھہرے گا کہ غزل میں قافیے کی پابندی شاعر کو اپنے خیالات نظم نہیں کرنے دیتی۔''(6)

مسعود حسن کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ قافیہ لفظ کی صورت میں ہمارے ذہن کو بہت سے خیالوں کی طرف منتقل کرسکتا ہے۔قافیے کی پابندی دراصل ان شاعروں کو اپنے خیالات نظم کرنے سے روکتی ہے جو صرف قافیہ پیمائی کرتے ہیں اور لفظ کے امکانات کی طرف ان کی نگاہ نہیں جاتی نیز وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ قافیے کی معنویت کو ردیف کی مناسبت سے کس طرح متحرک کیا جاسکتا ہے۔ ایسے شاعر محض قافیے کو نظم کرنے کا فرض ادا کرتے ہیں، قافیے کے وسیلے سے کسی خیال کو اپنی گرفت میں لاکر اسے 'اپنے' خیال کی صورت میں نظم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

یہاں یہ بھی بتادیا جائے کہ ایک لفظ سے ذہن کے بے شمار خیالوں کی طرف منتقل ہونے کی بات ملارمے نے بھی کہی ہے۔

حصۂ اول کے مباحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مسعود حسن نے یہ بتایا ہے کہ کلام کے اثر میں اضافے کے لیے موزونیت کے علاوہ اور کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''کلام دو عنصروں سے مرکب ہوتا ہے، ایک خیال دوسرے الفاظ۔ لہٰذا کلام کے بااثر ہونے کے لیے کچھ خصوصیتیں خیال میں ہونا چاہیے اور کچھ الفاظ اور ان کی بندش یعنی طرزِ ادا میں''(7)۔ ان خصوصیتوں کو انھوں نے شعر کی معنوی اور لفظی خوبیاں قرار دیا ہے۔

شعر کی معنوی خوبیوں کے ذیل میں مسعود حسن نے اصلیت، سادگی، بلندی، باریکی اور تڑپ وغیرہ کے مفاہیم کو واضح کیا ہے۔ حالی کے علی الرغم مسعود حسن نے اصلیت کے مفہوم پر زیادہ وضاحت اور زیادہ تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے حالی کی بیان کی ہوئی اصلیت کی تعریف سے اختلاف نہیں کیا ہے لیکن مسعود حسن کی وضاحتوں سے اصلیت کے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی پیچ باقی نہیں رہتا۔ مزید یہ کہ وہ اس کی وضاحت میں کچھ ایسے

---

6 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 48

7 ایضاً، ص 53-52

نکتے بھی نمایاں کرتے ہیں جن پر حالی کی نگاہ نہیں تھی۔ پہلے تو یہ دیکھیے کہ مسعود حسن رضوی نے کتنے واضح اور آسان لفظوں میں اصلیت کی وضاحت کی ہے۔

''شعر میں خیال کی اصلیت سے یہ مراد ہے کہ جس چیز سے وہ خیال متعلق ہے اس کا وجود حقیقت میں ہو، یا عقل یا اعتقاد کی رو سے ممکن ہو یا مان لیا گیا ہو... کسی منظر یا حالت یا واقعے کے بیان سے شاعر کا مقصود کوئی خاص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے موضوع بیان کے صرف وہ رخ نمایاں کرتا ہے جن سے اس کو وہ مخصوص اور مقصود اثر پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اثر انگیزی میں مخل ہوتے ہیں۔ یعنی شاعر کا بیان فطرت یا حقیقت کی صرف نقالی نہیں ہوتا، بلکہ اس سے کسی قدر مختلف، فطرت سے ایسا اختلاف اور حقیقت سے اتنا انحراف جو بادی النظر میں محسوس نہ ہو اور کلام کے اثر میں اضافہ کر دے، شاعرانہ اصلیت کے منافی نہیں ہے۔

جذبات کے اظہار میں انسانی فطرت کا اتباع ضروری ہے۔ اگر جذبات فطرت کے خلاف ہوں گے تو کلام میں اصلیت نہ رہے گی۔ اصلیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کلام مقتضائے مقام کے موافق ہو اور اس کے اجزا میں تضاد نہ ہو۔''(8)

مسعود حسن کی اصلیت کی تعریف حالی کے اصلیت کے مستعار تصور سے اگرچہ مختلف نہیں ہے لیکن مسعود حسن کی سہل اور سریع الفہم وضاحت اصلیت کے حدود کو حالی کی بتائی ہوئی پانچ صورتوں کے حدود سے کچھ آگے لے جا کر نئے رخوں کو روشن کرتی ہے۔ آگے چل کر مسعود حسن شاعرانہ اصلیت اور حکیمانہ حقیقت کا فرق بھی بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ شاعرانہ اصلیت اور حکیمانہ حقیقت ایک چیز نہیں ہیں۔ حکیم ہر شے کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ فی نفسہ کیا ہے اور شاعر اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ ہمیں کیا معلوم ہوتی ہے...

حکیمانہ اور شاعرانہ نقطۂ نظر میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حکیم ہر شے کا ذہنی یا عملی تجزیہ کر کے اس کے ایک ایک جز کو دیکھتا ہے، اور شاعر ہر چیز پر مجموعی

---

8 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 55-54-53

حیثیت سے نظر کرتا ہے۔ حکمت کی نظر بہ ظاہر یکساں چیزوں میں اختلاف کے وجوہ تلاش کر لیتی ہے اور شاعر کی نگاہ بہ ظاہر مختلف چیزوں میں یکسانی کے پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے۔''(9)

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''حکیم اور شاعر کے اندازِ بیان میں ایک خاص فرق اور بھی ہوتا ہے۔ حکیم علّت و معلول سے بحث کر کے کسی حقیقت کو ذہن میں بٹھا دیتا ہے اور شاعر ہمارے اور اشیائے خارجی کے جذباتی تعلق کو ابھار کر کسی حقیقت کو دل میں اتار دیتا ہے۔ حکیم حقیقت کو دماغ کے ذریعے سے ہم تک پہنچاتا ہے اور شاعر دل کے راستے سے۔ حکمت سے ہم چیزوں کو معلوم کرتے ہیں اور شاعری سے محسوس۔''(10)

ان بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسعود حسن رضوی اصلیت کے ہر پہلو کو نگاہ میں رکھ کر اس کے مفہوم کی وضاحت کر رہے ہیں۔ انھوں نے ان بیانات کو مناسب مثالوں کے ذریعے اور بھی قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ انھیں پڑھ کر یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان کے یہاں اصلیت کے مفہوم کی توسیع کی جا رہی ہے۔

اصلیت کے بعد مسعود حسن نے سادگی، باریکی اور تڑپ کے مفہوم کو بھی مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔

معنوی خوبیوں کے بیان کے بعد مسعود حسن نے شعر کی لفظی خوبیوں پر گفتگو کی ہے اور اس گفتگو میں بھی انھوں نے ہر نکتے کو نگاہ میں رکھا ہے۔ اس باب میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ بیان کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کن کن طریقوں سے کون کون سی لفظی خوبیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ یہاں مسعود حسن نے بیان کی سادگی اور اس کے لوازم، لفظی و معنوی تعقید، تشبیہ، استعارہ، تلمیح کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اختصار اور اس کی مختلف تدبیروں کا بھی ذکر کیا ہے نیز الفاظ کی مناسبتوں کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں اور صنعتوں

---

9 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبع دوازدہم 1974، ص 58-57

10 ایضاً ص 60-59

اور ان کے حسنِ استعمال پر گفتگو کی ہے۔

اس باب میں بھی مسعود حسن رضوی نے ایک اہم نکتے کو نمایاں کیا ہے۔ سادگی پر گفتگو کرتے ہوئے شعر کے مفہوم تک پہنچنے کے لیے انھوں نے جزوِ مقدر اور جزوِ مذکور کے رشتوں کی وضاحت میں لکھا ہے:

''اگر خیالات کے ایک سلسلے میں سے ایک کڑی حذف کر دی جائے تو ذہن اسے بہ آسانی خود فراہم کرلیتا ہے۔،، (11)

ہماری موجودہ تنقید میں بھی متن میں وقفوں، درزوں اور رخنوں کی بات کہی جاتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ متن کی ترجمانی کرتے وقت یہ سب کے سب قاری ہی کے ذریعے بھرے جاتے ہیں۔ محولہ بالا اقتباس میں یہی بات کہی گئی ہے کہ معنی اخذ کرنے کے عمل میں بیان میں چھوٹے ہوئے حصے کو قاری خود بھرلے گا۔ اس طرح آج کی تنقید میں نمایاں کیے جانے والے اس نکتے کا اشارہ مسعود حسن رضوی کے یہاں بہت پہلے مل جاتا ہے۔

جزوِ مقدر اور جزوِ مذکور کی وضاحت کے بعد اختصارِ کلام کے ضمن میں بھی بہت پتے کی بات کہی ہے:

''لفظوں کی زیادتی اگر مطلب کی توضیح، کلام کی تاثیر یا بیان کی تزئین کے لیے ضروری ٹھہرے تو وہ بھی اختصار کے اندر آجائے گی اور لفظوں کی کمی اگر خیال کے مکمل اور واضح اظہار میں حائل ہو تو یہ اختصار کا وصف نہیں اغلاق کا عیب ہوگا۔ یاد رہے کہ اختصار وہی پسندیدہ ہے جو کلام کو سادگی کی صفت سے محروم نہ کردے۔،، (12)

اس باب میں مسعود حسن نے جدّت کی وضاحت بھی خوب کی ہے۔ ان کے بقول:

''موجودہ مواد کو نئی صورت دینا یا اس سے نیا کام لینا ہر فن میں جدّت کہلاتا ہے۔ نیا مواد پیدا کرنا جدّت کے مفہوم میں داخل نہیں ہے... اس کا

11 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 73

12 ایضاً ص 80

تعلق طریقۂ اظہار یا طرزِ ادا سے ہے۔ ہم کبھی کبھی کسی خیال کو بھی جدید کہہ دیتے ہیں مگر فی الحقیقت اس سے ہماری مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ خیال غیر معمولی ہے یا موجود اجزا کا نیا مجموعہ ہے۔"(13)

•

مباحث کے اعتبار سے ہماری شاعری کا دوسرا حصہ زیادہ اہم ہے۔ اس حصے میں مسعود حسن رضوی نے ہماری شاعری کے مسائل پر نظری بحثیں کی ہیں اور اپنی بحثوں کے اطلاقات کی عمدہ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس حصے میں مسعود حسن نے شاعری کے اسی پہلو پر گفتگو کی ہے جو حالی کے یہاں پوری طرح بحث کا موضوع نہیں بن سکا یعنی ہماری غزلیہ شاعری۔ مخصوص اور محدود مضامین کی ترجمانی کی وجہ سے حالی نے غزل کو محض ایک بے سود اور دور از کار صنف قرار دیا تھا اور غزل کو منفی پہلوؤں کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیا تھا:

"عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔"(14)

حالی کا مقصود یہ ہے کہ غزل اپنے مخصوص موضوعات کی وجہ سے زمانۂ حال کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ مسعود حسن رضوی نے غزل کے بارے میں ان خیالات کی نفی کی اور غزل کے مضامین کی وسعت اور ان کی ہمہ گیری پر ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا:

"ایک عام خیال یہ ہے کہ غزل میں صرف عشقیہ مضامین باندھے جاتے ہیں، بالخصوص جن شعروں میں یار، دوست، محبوب، ظالم، قاتل، بیدادگر یا اسی قبیل کے اور لفظ آتے ہیں۔ اور جن شعروں میں کسی کا صاف طور پر ذکر نہیں

---

13 ۔ ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبع دوازدہم 1974، ص 101

14 مقدمۂ شعر و شاعری، مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد 1964، ص 266

ہوتا، صرف ضمیروں کے اشارے ہوتے ہیں، وہ سب کے سب عاشق و معشوق کے باہمی تعلقات بیان کرتے ہیں۔ یہ ایسی غلطی ہے جس سے ادّعائے سخن فہمی کا دامن اکثر داغ دار نظر آتا ہے۔ اگر غزل صرف عشقیہ مضامین کے لیے مخصوص ہوتی تو بھی جو لوگ محبت کے مفہوم کی ہمہ گیری اور عشق کی دنیا کی وسعت سے واقف ہیں، ان کی نگاہوں میں غزل کا دائرہ بہت تنگ نہ ٹھہرتا۔،،(15)

غزل کی ہمہ گیری کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرنے کے بعد بظاہر عشقیہ مضامین سے متعلق مختلف شعروں کی تشریح کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ ان شعروں کے مفاہیم کس طرح مختلف صورتوں اور وقوعوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ شعروں کی ان تعبیروں سے مسعود حسن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اوّل تو غزل کو صرف عشقیہ موضوعات پر مشتمل نہ سمجھنا چاہئے، دوسرے یہ کہ عشقیہ موضوعات سے متعلق نظر آنے والے شعر بھی فقط جذبۂ عشق کے اظہار تک محدو نہیں رہتے۔ ان کے بقول:

،،گل و بلبل۔ ان دو لفظوں سے شاعروں نے جو جو چیزیں مراد لی ہیں، ان کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اردو اور فارسی شاعری میں گل و بلبل کا قریب قریب وہی حال ہے جو یوروپی زبانوں کی شاعری میں یونانی دیومالا کی دیویوں اور دیوتاؤں کا ہے۔ اس لیے جتنے شعروں میں گل و بلبل کا ذکر آتا ہے ان سب کو یکساں سمجھنا غلطی ہے اور بہت بڑی غلطی ہے۔ اس مقام پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ شاعر کو جو بات کہنا ہے، جو واقعہ بیان کرنا ہے، اس کو صاف صاف کیوں نہیں ادا کردیتا ہے، گل و بلبل کو بیچ میں کیوں ڈالتا ہے۔ اردو شاعری میں گل و بلبل کے علاوہ سرو، قمری، صیاد، گلچیں، گلشن، آشیانہ، قفس، خرمن، بجلی، شراب، ساقی، بادہ، ساغر، محشر، قیامت، تبر، شمشیر وغیرہ صدہا لفظ ایسے آتے ہیں جن کے ذریعے سے شاعر اپنا مطلب تمثیل کے پیرائے میں ادا کرتا ہے۔،،(16)

---

15 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبع دوازدہم 1974، ص 119

16 ایضاً ص 134-135

یہیں حاشیے میں مسعود حسن رضوی طباطبائی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں:

''گل وبلبل، شمع و پروانہ وغیرہ کا ذکر شعر میں جب ہی تک حسن دیتا ہے جب کوئی تمثیل کا پہلو اس میں صاف نکلے ... لیکن جہاں تمثیل صاف نہ نکلے اور یہ معلوم ہو کہ فقط گل وبلبل کا حال بیان کرنا مقصودِ شعر ہے، وہ شعر بے مزہ ہوتا ہے۔''(17)

اپنے اصل قول کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مسعود حسن لکھتے ہیں:

''سوال یہ تھا کہ شاعر واقعات کو کھلے ہوئے لفظوں میں بیان کرنے کی جگہ گل وبلبل کے پردے میں، یعنی تمثیلی الفاظ میں کیوں بیان کرتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ تمثیلی الفاظ کے استعمال سے کلام میں تاثیر، اختصار اور جامعیت پیدا ہوجاتی ہے۔''(18)

پھر لکھتے ہیں:

''بیانِ واقعہ بالذات شاعر کا مقصود نہیں ہوتا۔''(19)

اس کے بعد شعروں کی مزید تشریح کر کے ان کے ایک سے زیادہ مفاہیم روشن کرنے کے بعد تمثیلی شعروں کی خصوصیت کے ضمن میں بتاتے ہیں:

''تمثیلی شعروں کے سمجھنے کا دعویٰ اس وقت کیا جاسکتا ہے، جب نگاہ تمثیل کے پردے سے گزر کر اصل حقیقت تک پہنچ جائے اور شاعر نے انسانی زندگی کے جس واقعے یا حالت یا کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا پورا پورا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے اور دل میں وہی جذبات اٹھنے لگیں جو اس واقعے یا حالت یا کیفیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پیدا ہوئے ہیں۔ ان شعروں کے سمجھنے کے لیے صرف لفظوں کے معنی جاننا کافی نہیں۔ شاعر کا مفہوم اس کے لفظوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کوئی خاص واقعہ یا حالت یا کیفیت دیکھتا ہے یا اس کا تصور کرتا ہے اور اس کے چند نمایاں پہلو ایسے لفظوں میں بیان

---

17 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 135

18 ایضاً ص 135

19 ایضاً ص 135

کردیتا ہے، جو سننے والے کے ذہن کو ان تمام تفصیلوں تک پہنچا دیتے ہیں
جنھیں شاعر نے چھوڑ دیا تھا۔''[20]

اس قول میں اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مگر ہر ذہن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ صرف انھیں لوگوں کا حصہ
ہے... جن کی قوتِ متخیلہ قوی ہے۔''[21]

ان بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ شمع و پروانہ اور گل و بلبل کے پیرائے میں ادا کیے جانے والے شعر محض بیانِ واقعہ تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کے پردے میں دوسرے مفاہیم کی ترجمانی بھی کی جاتی ہے۔ یعنی ان کے تمثیلی یا اشارتی پیرائے میں کثرتِ معنی کی صفت ہوتی ہے اور اصلاً یہی پیرایہ غزل کی اصل خصوصیت کو نمایاں کرتا ہے یعنی کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنا۔ مسعود حسن کا یہ کہنا کہ ''شاعر کا مفہوم اس کے لفظوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔'' لفظ کی معنوی قوت اور وسعت پر دلالت کرتا ہے۔ ان بیانات میں وہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے جسے آج کی جدید تر تنقید وقفوں اور درزوں (Gaps, Lacunaes) سے تعبیر کرتی ہے۔ ان وقفوں اور درزوں کو قاری اپنی فہم کے ذریعے پر کرتا ہے اور چھوٹی ہوئی تفصیلوں تک پہنچ کر شعر کا مفہوم دریافت کرلیتا ہے۔ لیکن مفہوم تک رسائی کے لیے ذہنِ رسا کا ہونا ضروری ہے۔ مسعود حسن بھی چھوٹی ہوئی تفصیلوں تک پہنچنے کے لیے قوتِ متخیلہ یعنی قاری کی ذکاوت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس باب کے اگلے مبحث میں مسعود حسن غزل میں ریزہ خیالی کا جواز پیش کرتے ہیں اور مختلف شعروں کی مثال پیش کرنے کے بعد اس ریزہ خیالی کا سبب یہ بتاتے ہیں:

''شاعر کبھی کسی چیز کا ایک پہلو دیکھتا ہے کبھی دوسرا، کبھی اُسی چیز کو ایک چیز کے مقابلے میں رکھ کے دیکھتا ہے کبھی دوسری چیز کے اور ہر چیز کی اضافی کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ وہی چیز کسی چیز سے اچھی ہے کسی سے بری۔ کسی سے بڑی ہے کسی سے چھوٹی۔''[22]

---

20 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبع دوازدہم 1974، ص 143

21 ایضاً ص 143

22 ایضاً ص 154

ریزہ خیالی کا سبب بتانے کے بعد وہ ایک اور اہم نکتے کو نمایاں کرتے ہیں:

''واعظانہ اور خطیبانہ کلام اپنے مفید نتیجوں کے لحاظ سے کتنا ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہو، نفسِ شاعری کے اعتبار سے وہ اس کلام کو ہرگز نہ پہنچے گا جس کا مقصد اظہارِ تاثرات یا تحریکِ جذبات کے سوا کچھ نہ ہو۔''(23)

اسی ذیل میں آگے لکھتے ہیں:

''شاعری کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھنا بہ ذاتِ خود تو برا نہیں لیکن اس کے جمالی پہلو کو نظر انداز کر دینا شاعری کی حقیقت کو بھول جانا ہے۔''(24)

مسعود حسن کے نزدیک شاعری کے افادی پہلو سے زیادہ اس کے جمالی اور جذباتی پہلو کی اہمیت ہے۔ یہ حالی کے خالص افادی نظریے کی نفی ہے۔'ہماری شاعری' کی اشاعت کے نو سال بعد جب ترقی پسند تحریک وجود میں آئی تو اس نے شاعری کے لیے واعظانہ اور خطیبانہ انداز کو اہم جانا۔ بعد میں اس انداز کی تنقید اسی لیے کی گئی کہ اس سے شاعری کا جمالی پہلو مجروح ہوتا ہے۔

غزل میں پریشاں خیالی کی وضاحت اور اس کے اسباب بتانے کے بعد مسعود حسن رضوی نے شاعری میں مقامی رنگ پر گفتگو کرتے ہوئے اس الزام کو غلط بتایا کہ اردو شاعری اس ملک میں ایک بدیسی چیز ہے۔ انھوں نے صاف صاف لکھا:

''اردو شاعری کا پتلا ہند کی خاک سے بنا اور نشو و نما بھی اسی سرزمین میں ہوئی۔ اس لیے گو وہ مدتوں فارسی شاعری کے نقشِ قدم پر چلتا رہا، مگر اس کی طبیعت نہیں بدلی، مزاج ہندستانی ہی رہا۔''(25)

اس طرح انھوں نے مقامی الفاظ و علامات کے استعمال سے شاعری میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی ترغیب دی اور اس مقامی رنگ کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اسی نکتے کی توسیع کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کو بھی دلیلیں دے کر غلط ٹھہرایا کہ'' اردو شاعری تقلیدی

---

23 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 158

24 ایضاً ص 159

25 ایضاً ص 159

اور غیر فطری ہے اور اردو شاعر فارسی سے لیے ہوئے مضامین کو دہراتے رہتے ہیں۔'' مسعود حسن نے اردو شاعری کے فارسی شاعری سے مشابہ ہونے اور بیشتر مضامین کے ایک سے ہونے کے اسباب بیان کیے اور موزوں مثالیں دے کر یہ نتیجہ نکالا کہ اردو شاعری نہ تقلیدی ہے نہ غیر فطری۔

اس کے بعد مسعود حسن نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ''عشقیہ شاعری میں معشوق جنسِ ذکور سے ہوتا ہے اور امرد پرستی کے جذبات نظم کیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ خلافِ فطرت بھی ہے اور مخربِ اخلاق بھی۔'' مسعود حسن کا کہنا ہے کہ'' اردو غزلوں میں ہزارہا شعر ایسے ملتے ہیں جن میں معشوق کی نسوانیت بے پردہ نظر آتی ہے۔'' مثال میں انھوں نے غالب، مومن اور آتش کے شعر نقل کیے ہیں۔ ان کے خیال میں اردو کے بیشتر شعروں میں'' یہ سمجھنا بھی دشوار ہے کہ معشوق جنسِ ذکور سے ہے یا جنسِ اناث سے۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں: ''معشوق کے لیے مذکر فعل لانا معشوق کے مرد ہونے کا ثبوت نہیں ہوسکتا''۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ غزل کے جن شعروں میں معشوق یقیناً طبقۂ نسواں سے ہے، ان میں بھی اس کے لیے مذکر ہی فعل یا صفت وغیرہ لائے گئے ہیں۔ اپنی بحث کو مزید مستحکم کرنے کی غرض سے مسعود حسن نے عشق کی تفصیل سے وضاحت کی ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

مسعود حسن کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہماری شاعری میں معشوق کے لیے مذکر فعل لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لفظ معشوق اور اس کے مترادف الفاظ محبوب، دوست، یار، بت، صنم، کافر وغیرہ سب مذکر ہیں۔

ان اہم بحثوں کے بعد مسعود حسن نے شاعری کے مسلمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور روایتی شاعری میں نظم کیے جانے والے مختلف مضامین کی صورت و نوعیت کو واضح کیا ہے۔ مسعود حسن کی اس گفتگو سے ہمیں شاعری کے مسلمات کا پورا علم ہوجاتا ہے اور ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری شاعری میں کن کن مفہوموں کو ادا کرنے کے لیے کون کون سے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ عاشق و معشوق کے لفظوں سے کیا مراد ہے نیز ہجر کے

مضامین کی کثرت کے اسباب کیا ہیں۔

کتاب کے آخر میں مسعود حسن رضوی نے غزل کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے جواب دیے ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''غزل بے ربط شعروں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ایسی نامربوط نظم فارسی اور اردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ غزل کے شعروں میں مختلف اور متضاد خیالات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور انسان ایک وقت میں مختلف اور متضاد خیالات و جذبات کا حامل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے غزل غیر فطری چیز ہے۔ غزل کے مختلف المضامین اشعار سے دماغ کو ٹھوکریں سی لگتی ہیں۔ غزل کے ایک شعر میں کسی نفسیاتی تجربے کا مکمل اظہار ممکن نہیں۔''(26)

اس طرح مسعود حسن رضوی نے شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری کے ہر اس پہلو سے بحث کی ہے جو ان کے خیال میں بحث طلب تھا اور ہر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو شاعری کے سنجیدہ قاری کو الجھن میں مبتلا کرتا ہے۔

ہماری شاعری کی اشاعت کے بعد ادبی دنیا میں اس کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ اس عہد کے نمائندہ ادیبوں نے کتاب کے مباحث کی ستائش کی اور اس کے مشتملات کی اہمیت کا اعتراف کیا اور صاف صاف لکھا کہ اس کی بحثوں نے شاعری کی تعبیر کے نئے جہات کو روشن کیا ہے۔ ذیل میں چند کی رائیں پیش کی جارہی ہیں:

ڈاکٹر عابد حسین نے لکھا:

> ''انھوں (مسعود حسن رضوی) نے 'ہماری شاعری' کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جسے ہم بے تکلف یوروپ کے بہترین نقادوں کی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کرسکتے ہیں۔ اس کتاب میں شاعری کی عام ماہیت سے محققانہ بحث کی گئی ہے۔''(27)

---

26 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 246

27 جامعہ، دہلی، مارچ 1928

سید سلیمان ندوی نے اپنے توصیفی تبصرے میں کتاب کی تحسین ان الفاظ میں کی :

''مصنف نے جس تفصیل، جس خوبی، جس شگفتگی، جس خوش اسلوبی اور جن مختلف پہلوؤں سے ہماری شاعری پر نظر ڈالی ہے اور جس طرح سے نگاہوں سے اوجھل نکتوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں وہ حد درجہ تحسین و داد کا مستحق ہے۔''(28)

یگانہ چنگیزی نے اپنے خاص انداز میں لکھا :

''یہ تو وہ تصنیف ہے جو یوروپ زدہ اصحاب کی غلامانہ ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی زبردست طاقت رکھتی ہے۔''(29)

عبدالستار صدیقی اپنے خط مورخہ 24 اپریل 1928 میں لکھتے ہیں:

''اردو میں ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے۔ ایک بہت ہی الجھے ہوئے مضمون کو اس سہل طریقے سے سلجھانا آپ ہی کا کام تھا۔''(30)

عبدالماجد دریابادی، ہمدرد، دہلی کے 17 جون 1928 کے شمارے میں 'ہماری شاعری' اور 'مقدمے' کے مباحث میں نقطۂ نظر کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصل اور بڑا فرق دونوں کتابوں میں نقطۂ نظر کے اختلاف کا ہے۔ مولانا حالی کا نقطۂ نظر اخلاقی تھا اور انھوں نے اردو شاعری پر ایک واعظ (مصلح) کی حیثیت سے نظر کی اور انھوں نے وہی لکھا جو انھیں لکھنا چاہیے اور شاعری پر وہ اعتراضات کیے جو تقریباً ہر شاعری پر وارد ہو سکتے ہیں۔ ہمارے مصنف ادیب کا نقطۂ نظر اس کے برخلاف تمام تر ادبی ہے۔ انھوں نے شاعری کے اس معیار کو تسلیم کر کے جو سارے عالم کی شاعری میں مسلم ہو چکا ہے، اردو شاعری کو اس پر جانچا اور بالکل کھرا پایا ہے۔''(31)

منوہر لال زتشی، اختر علی تلہری، محمد حفیظ سیّد، مرزا محمد عسکری، علی عباس حسینی، ڈاکٹر

---

28 معارف۔ اعظم گڑھ، جنوری 1929

29 نیرنگِ خیال۔ مئی 1930

30 مملوکۂ طاہر تونسوی

31 ایضاً

گیان چند جین اور دوسرے بہت سے ادیبوں نے ہماری شاعری کی تعریف و تحسین کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کتاب کی اشاعت کے سینتالیس سال بعد 1974 میں 'ہماری شاعری پر ایک نظر ثانی' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ فاروقی نے اپنے اکتیس صفحے کے مضمون (مشمولہ تنقیدی افکار) میں کتاب کے بیشتر مباحث سے اختلاف کرتے ہوئے اور مسعود حسن رضوی کو اصلاً حالی اسکول کا نقاد قرار دیتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ اس جملے میں 'ہماری شاعری' کی دبی زبان میں تحسین کی ہے:

> ''اپنی موجودہ حالت میں ہماری شاعری نظریہ سازی اور کلّیہ تراشی کی ایک غیر معمولی کوشش ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت [تنقیدی نہیں] مسلّم ہے اس میں بیان کردہ بہت سے نکات و مطالب نے جدید تنقید کی تعمیر میں خاموش مگر گہرا کام کیا ہے۔''(32)

شمس الرحمٰن فاروقی نے کتاب کے بیانات سے اختلافات کرنے اور اس کے مصنف پر اعتراضات وارد کرنے میں اصولِ نقد کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اصولِ نقد کے اعتبار سے جس نکتے یا بیان سے اختلاف کیا جا رہا ہے اس کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے پورے بیان کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جس سے پڑھنے والا بھی اس بیان کی ماہیت کو سمجھ کر اختلاف کی اہمیت کو جان لے۔ ایسا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم جس نکتے سے اختلاف کر رہے ہیں عین ممکن ہے کہ زیرِ بحث بیان کے اگلے حصے میں خود مصنف نے اس کا وہ رخ پیش کر دیا ہو جو ہمارے اختلاف کا محرک بنا ہے لیکن جہاں اختلاف و اعتراض ہی غرضِ تنقید ہو وہاں ہم اسی بیان کو یا بیان کے اسی حصے کو پیشِ نگاہ رکھتے ہیں جس پر اختلاف کی ضرب لگانا چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس نوع کے اختلافات کے لیے ضروری ہے کہ زیرِ بحث مباحث سے متعلق مصنف کی دوسری تحریریں بھی ہماری نگاہ میں ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مسعود حسن رضوی کی کتاب 'آئینۂ سخن فہمی' کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ یہ کتاب 'جوہرِ آئینہ' اور 'منظرِ آئینہ' کے ناموں سے شائع ہونے والی ان کتابوں کے جواب میں لکھی گئی تھی جن میں 'ہماری

32 تنقیدی افکار۔ شمس الرحمٰن فاروقی 1984، ص 179

شاعری' کے بعض بیانات پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ مسعود حسن رضوی نے ان اعتراضوں کے مدلّل جواب دیے اور ان جوابات سے 'ہماری شاعری' کے مباحث اور زیادہ روشن اور واضح ہوگئے۔ یہ کتاب اگر فاروقی کے مطالعے میں ہوتی تو ان کے مضمون کی نوعیت بڑی حد تک بدل جاتی۔ اب بھی اگر فاروقی اس کتاب کا مطالعہ کریں تو انھیں 'ہماری شاعری' پر کیے ہوئے بہت سے اعتراضات پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوسکتی ہے۔

اپنے مضمون میں فاروقی نے ہماری شاعری کے دیباچے کے ایسے بیانات پر بھی اعتراض کیا ہے جن کا اعتراف اس عہد کے ادیبوں نے بیک زبان کیا ہے۔ فاروقی مسعود حسن رضوی کے اِن بیانات کو انانیت، ادعائیت اور خودپسندی پر محمول کرتے ہوئے انھیں اس ترتیب کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

(1) ''یہ مطالب اس ترتیب، تفصیل، اور توضیح کے ساتھ اس سے پہلے نہیں بیان کیے گئے تھے۔''

(2) ''کتاب میں بیان کی صفائی اور دل کشی قائم رکھنے کے لیے لفظوں کے انتخاب میں جتنی کاوش کی گئی ہے اور نازک سے نازک خیالوں کو اجنبی لفظوں، غیر مانوس ترکیبوں اور علمی اصطلاحوں سے بچ کر عام فہم زبان اور دل نشیں انداز میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے...''

(3) ''یہ کتاب مدت کے غور و فکر، تلاش و تجسس، وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کا نتیجہ ہے۔''(33)

نہیں معلوم کہ فاروقی نے مسعود حسن رضوی کے اظہارِ حقیقت میں انانیت اور خودپسندی کا پہلو کس بنا پر تلاش کرلیا۔ کیا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ یہ مطالب اس ترتیب، تفصیل اور توضیح کے ساتھ اس سے پہلے نہیں بیان کیے گئے تھے۔ مصنف نے خصوصی اور ذیلی عنوانات کے ماتحت اپنے مباحث کی مسلسل اور تفصیلی وضاحت کے لیے کتاب کے ہر مبحث میں جس ترتیب کو قائم رکھا ہے وہ اس سے پہلے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ پھر یہ کہ

33 تنقیدی افکار۔ شمس الرحمٰن فاروقی 1984، ص 162-161

مسعود حسن نے یہ جملہ لکھنے سے قبل اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کے مطالب سے بعض دوسرے مصنفوں نے بھی بحث کی ہے اور مصنف نے ان کی تحریروں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ ''وسیع نظریں دیکھ لیں گی کہ کہاں کہاں خوشہ چینی کی گئی ہے اور کہاں کہاں نکتہ آفرینی۔'' جہاں دوسروں کی تحریروں سے فائدہ اٹھانے اور خوشہ چینی کی جانے کی بات کہی جا رہی ہو وہاں اوعائیت اور خود پسندی کا کیا سوال۔

اور کیا بیان نمبر2 کی یہ بات غلط ہے کہ مصنف نے اپنے موقف اور نقطۂ نظر کی ترسیل کے لیے نازک سے نازک خیال کو اجنبی لفظوں، غیر مانوس ترکیبوں اور علمی اصطلاحوں سے بچ کر عام فہم زبان اور دل نشیں انداز میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

آج ہماری بیشتر تنقید انھیں اجنبی لفظوں، غیر مانوس ترکیبوں اور علمی اصطلاحوں سے بوجھل ہے۔ اس نوع کی تنقید میں مبحث کی وضاحت تو ہوتی نہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ نقاد کا مقصد اپنے اس علم سے مرعوب کرنا ہے جو کوشش کے باوجود اس کی بصیرت کا حصہ نہیں بن سکا ہے۔ اپنی تحریروں میں خود فاروقی بھی ان لفظوں، ترکیبوں اور اصطلاحوں سے بچنے کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ رہی دل نشیں انداز کی بات تو تنقید کے سے خشک موضوع کو خشک زبان اور بھی خشک بنا دیتی ہے۔ اس لیے ایسا انداز ضروری ہے جس سے بحث کا تنقیدی مزاج اور پڑھنے والے کی دل چسپی دونوں قائم رہیں۔ یہاں بھی فاروقی نے مسعود حسن رضوی کے اس بیان کا وہ حصہ شامل نہیں کیا جس میں نقل کیے ہوئے قول کا جواز موجود ہے۔ مسعود حسن رضوی فاروقی کے اعتراض کی زد میں آئے ہوئے بیان سے پہلے لکھتے ہیں:

> ''بیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہے سننے والا وہی سمجھے، آسانی سے سمجھے اور اس کے سوا کچھ اور نہ سمجھے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ سننے والے کو بیان میں ایسی لذت ملے کہ وہ اس کو پوری توجہ اور دل چسپی کے ساتھ سنتا رہے۔''(34)

34 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 25

اسی کے بعد بیان کا وہ حصہ ہے جس پر فاروقی نے انانیت کا الزام عائد کیا ہے۔

اسی طرح بیان نمبر 3 میں اس بات سے کیوں کر انکار کیا جاسکتا ہے کہ 'ہماری شاعری' مدت کی غور وفکر، تلاش وتجسس، وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

حالی سے مختلف اپنی شعریات مرتب کرنے میں یقیناً غور وفکر کی ضرورت تھی اور تلاش وتجسس کے بغیر نہ تو نئے نکات و مطالب ذہن میں آسکتے تھے نہ مباحث کو مستحکم کرنے کے لیے موزوں مثالیں مل سکتی تھیں۔ اور جہاں تک وسعتِ مطالعہ کا تعلق ہے تو ادب کا باذوق قاری محسوس کرسکتا ہے کہ 'ہماری شاعری' کے مصنف نے کتاب کے بیانات کو معتبر اور بامعنی بنانے کے لیے اپنے مطالعے کی وسعت سے کیا کیا کام لیے ہیں۔ کتاب کے سرسری مطالعے ہی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مسعود حسن رضوی اردو کی شعری روایت کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی شعریات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اور اگر عمیق مشاہدہ نہ ہوتا تو وہ دلیلیں کیوں کر وضع ہوتیں جن سے مصنف نے اپنے نتائج میں وزن پیدا کیا ہے۔

اس طرح مسعود حسن رضوی نے دیباچے میں جو کچھ کہا ہے پڑھنے والا اسے کتاب کے اندر موجود پاتا ہے اور جو کچھ کتاب کے اندر موجود ہے، اگر اس کا اظہار دیانتداری کے ساتھ مصنف نے کردیا تو اسے انانیت اور خود پسندی سے تعبیر کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

محولہ بالا بیانات کے تعلق سے مسعود حسن رضوی پر انانیت کا الزام لگاتے وقت فاروقی اپنے ان بیانات کو بھول گئے، جو متذکرہ مضمون سے ایک سال قبل یعنی 1973 میں شائع ہونے والی ان کی کتاب 'شعر، غیر شعر اور نثر' کے دیباچے بعنوان 'غبارِ کارواں' میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

مثال میں صرف ایک جملہ ملاحظہ ہو: ''اردو تنقید میں بہت سے نظریات، بہت سے طریقِ کار جن کے بارے میں بلا کسی تعلّی کے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے عام کیے ہیں۔'' اسے انانیت نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔ مسعود حسن رضوی اور فاروقی کے اس نوع کے جملوں میں فرق یہ ہے کہ مسعود حسن کے یہاں جو باتیں خود ستائی کے جذبے کے بغیر اظہارِ حقیقت کے طور پر کہی گئی ہیں، فاروقی کے یہاں انھیں باتوں کے اظہار میں خودنمائی

اور متکبرانہ انکسار نظر آتا ہے۔

'ہماری شاعری' کے مباحث سے فاروقی نے جو اختلافات کیے ہیں ان سے بحث کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ اس نوع کی بحث زیرِ تصنیف کتاب کے احاطۂ تحریر میں شامل نہیں ہے تاہم ایک آدھ نکتے کی طرف اشارہ اس لیے ضروری ہے کہ فاروقی کے بعض بیانوں کی وجہ سے 'ہماری شاعری' کے متعلق کوئی غلط فہمی راسخ و رائج نہ ہو جائے۔ مثلاً غزل کے علامتی یا تمثیلی اسلوب کی تفہیم سے متعلق مسعود حسن رضوی کے اس بیان کو نقل کرنے کے بعد فاروقی کی رائے سنیے:

> ''غزل کا ہر شعر بالعموم ایک مستقل نظم ہوتا ہے۔ ان دو دو مصرعوں کی نظموں کا اختصار شاعر سے رمزی یا ایمائی، علامتی یا تمثیلی اسلوبِ بیان کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مختصر نظموں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا، ان کے مضمرات کو سمجھنے پر منحصر ہے اور اس کے لیے شاعری کی مسلمہ قدروں اور معیاروں سے پوری واقفیت ضروری ہے۔''(35)

بیان نقل کرنے کے بعد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''کسی زبان کے کچھ مخصوص فنی قوانین کو معطل کر کے اس زبان کے ادب کا صحیح مطالعہ ممکن نہیں' ہے۔ یہ نظریہ (جہاں تک مجھے یاد آتا ہے) اردو میں سب سے پہلے محمد حسن عسکری نے مدلل طور پر پیش کیا تھا۔ مسعود حسن رضوی بھی اس کے موید نظر آتے ہیں۔''(36)

یہاں اہم بات یہ ہے کہ زمانی اعتبار سے سبقت کسے حاصل ہے، مسعود حسن رضوی کو یا محمد حسن عسکری کو۔ اگر مسعود حسن رضوی کو سبقت حاصل ہے (اور ظاہر ہے کہ حاصل ہے) تو اس نظریے کے موید کون ہوئے عسکری یا مسعود حسن رضوی۔ 'ہماری شاعری' کی تصنیف کا زمانہ تو معلوم ہے لیکن عسکری سے منسوب فاروقی کے بیان کیے ہوئے نظریے کا زمانہ فاروقی نے نہیں لکھا۔ لیکن نہ لکھنے کے باوجود یہ بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ باتیں

---

35 ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی ادیب: طبعِ دوازدہم 1974، ص 19

36 تنقیدی افکار، شمس الرحمٰن فاروقی، ص 71-70

پہلے عسکری نے نہیں، مسعود حسن رضوی نے کہی ہیں۔
شمس الرحمٰن فاروقی کے پورے مضمون کے بغور مطالعے کے بعد یہ تاثر قائم ہونے میں دیر نہیں لگتی کہ چند خوبیوں کے اعتراف کے پردے میں فاروقی کا مقصد کتاب کی مسلمہ اہمیت کو کم کرنا ہے۔

•

بہرحال 'ہماری شاعری' کے ورق در ورق مطالعے کے بعد ہمیں یہ یقین کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ مصنف نے اس تصنیف کے جو اہم مقاصد بیان کیے ہیں وہ اس کتاب میں پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں یعنی شعر کا صحیح ذوق، سخن فہمی کا ملکہ اور نقدِ شعر کی قوت پیدا کرنا اور شاعری کا روشن رخ نمایاں کر کے ... اس کا وقار قائم کرنا۔

آئینۂ سخن فہمی

کہا جاچکا ہے کہ یہ کتاب ان دو رسالوں کے جواب میں لکھی گئی تھی جو ایک سال کے وقفے سے 1935 اور 1936 میں 'جوہر آئینہ' اور 'منظرِ آئینہ' کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ 'آئینۂ سخن فہمی' 1959 میں نظامی پریس سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے قبل 'جوہر آئینہ' کے جواب میں مسعود حسن رضوی کے چھ مضمون 1937 اور 1939 کے درمیان وقفے وقفے سے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ جنھیں 'آئینۂ سخن فہمی' میں یکجا کر دیا گیا۔ 'منظرِ آئینہ' کے جواب میں بھی اسی زمانے میں کئی مضامین لکھے گئے لیکن ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بعد میں انھیں بھی 'آئینۂ سخن فہمی' میں شامل کرلیا گیا۔

'جوہرِ آئینہ' اور 'منظرِ آئینہ' میں ہماری شاعری کے جن مشتملات کو اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا ہے ان میں اختصار کا اصطلاحی مفہوم، دبیر کی رباعی اور انیس کا شعر: تشریح و تقابل، میر کا ایک شعر اور حشویات، میر اور نظیر کے ہم مضمون قطعوں کا تقابلی مطالعہ، داغ کا ایک شعر، یگانہ کے دو شعروں کی تشریح، حسنِ بیان کا اعجاز، مبالغہ یا واقعیت، الفاظ کی جزالت وفخامت، تعقید، جدتِ ادا کی ایک مثال وغیرہ شامل ہیں۔

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
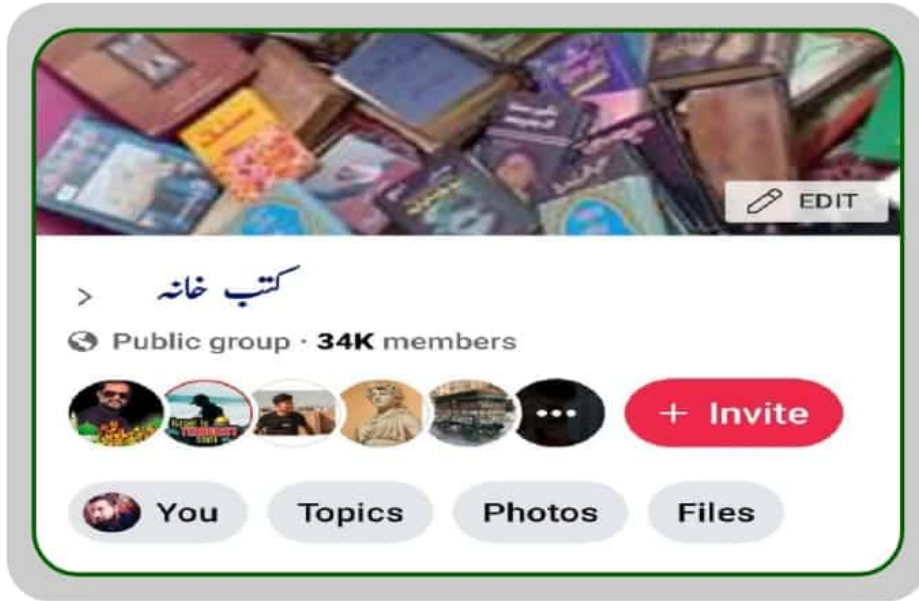
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

'ہماری شاعری' کے مصنف نے ان اعتراضات کے مدلّل جواب دیے ہیں نیز ان اعتراضات کی زبان میں جو خامیاں ہیں، آخر میں ان کی گرفت بھی کی گئی ہے۔ مسعود حسن رضوی کے جوابوں سے 'ہماری شاعری' کے مباحث اور زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔

شاعری سے متعلق مضامین

(1)	اردو شاعری کا زریں عہد	علی گڑھ میگزین، سالنامہ دسمبر 1932
(2)	حکمت اور شاعری	جہانگیر نظام نمبر، اکتوبر 1934
(3)	صنفِ غزل پر ایک تحقیقی نظر	نگار، فروری۔ مارچ 1946
(4)	حضرت جگر مرادآبادی کے سوگ میں	ہماری زبان، 22 دسمبر 1960
(5)	علامہ کیفی اور صنفِ غزل	ہماری زبان، 15 اگست 1968
(6)	شاعری کا مستقبل (مباحثہ)	قومی آواز، لکھنؤ

•

آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ

محمد حسین آزاد محمد حسن رضوی ادیب کے پسندیدہ ادیبوں میں سے تھے۔ آبِ حیات کے بیانات کو شروع سے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے اور یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ آزاد نے غیر مصدقہ باتوں کو معتبر ماخذوں تک رسائی حاصل کیے بغیر مبالغے کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ کم و بیش ہر محقق نے آزاد کو اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے۔ آزاد پر انھیں تنقیدوں اور نکتہ چینیوں کو نگاہ میں رکھ کر مسعود حسن رضوی نے ضروری اور مناسب جانا کہ ان اعتراضات کا معقول اور مدلّل جواب دیا جائے۔ ان کے بقول:

> ''آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی ہے اور پھیلائی جارہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دسترس سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہے اس کو آزاد کا گھڑا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی

تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی تحقیق کو غلطیوں سے مفر نہیں، لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کا فرق سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔،،(37)

مسعود حسن آبِ حیات میں غلطیوں کے راہ پا جانے کا انکار نہیں کرتے لیکن آزاد کو سخت تنقید کا نشانہ بنائے جانے پر وہ ایسے معترضین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تحقیق میں غلطی ہوجانا اور چیز ہے اور بلا تحقیق کچھ لکھ مارنا اور چیز ہے۔ ان ناگزیر غلطیوں کی بنا پر کسی کتاب کو کلیتاً پایۂ اعتبار سے ساقط کردینا اور اس کے مصنف کی عرق ریزیوں اور جاں فشانیوں پر پانی پھیر دینا بے دردی بھی ہے اور جہالت بھی۔،،(38)

چھبیس عنوانات پر مشتمل سو صفحات کو محیط اس مختصر سی کتاب میں مسعود حسن رضوی نے معتبر ماخذوں کی مدد سے آزاد کے انھیں بیانات کا بالتحقیق دفاع کیا ہے جنھیں اعتراضات کی زد میں لاکر محققین نے آبِ حیات کو درجۂ اعتبار سے گرانے کی کوشش کی ہے۔ آزاد کے ان بیانات میں۔ ولی اردو کا پہلا شاعر، مرزا مظہر جانِ جاناں کی حسن پرستی، میر کے والد کا نام، سید انشا کا جنون، ذوق اور غالب، ذوق اور ظفر، ناسخ کے تین دیوان، ناسخ کی قصیدہ گوئی، ناسخ کی ایک مثنوی اور ناسخ کا مذہب وغیرہ شامل ہیں۔
مسعود حسن رضوی نے میر کی شخصیت اور میر اور خانِ آرزو کے رشتوں سے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے اعتراضات کے بھی جواب دیے ہیں۔ اس کتاب کے تحقیقی معیار اور استدلالی طریقۂ کار کا اعتراف کرتے ہوئے مظفر علی سید لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں انھوں نے نہ صرف سطحی اعتراض کرنے والوں کو سنجیدگی سے جواب دیے ہیں بلکہ آبِ حیات اور اس کے مصنف کو اردو تحقیق کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خراجِ تحسین ادا کیا ہے جو ہم پر اسی سال سے قرض تھا... جو بے انصافی اس کام کے حق میں صفیر بلگرامی، مولوی عبدالحق، مصنفِ گلِ رعنا،

37 دیباچۂ فیضِ میر۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، 1929

38 آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، طبع اول 1953، ص 23

فرحت اللہ بیگ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے ہاتھوں ہوئی تھی، اس کتاب نے بڑی حد تک اس کی تلافی کردی۔"(39)

کتاب پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر آہ نے لکھا:

"یہ کتاب توازنِ تحقیق اور صفائیِ استدلال کا نادر نمونہ ہے۔ اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی مخالفِ آزاد کو یہ ہمت نہ ہوسکی کہ اس کی ایک دلیل کو بھی رد کر سکے۔"(40)

'آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ' پہلی بار 1953 میں اسرار کریمی پریس جانسن گنج، الہ آباد سے شائع ہوئی جس میں ماخذوں کی تعداد 47 ہے اور دوسری بار مطالب کے اضافے کے ساتھ نظامی پریس، لکھنؤ سے 1964 میں طبع ہوئی۔ اس میں ماخذوں کی فہرست 47 سے بڑھ کر 73 ہوگئی ہے۔

---

39 نقوش۔ اگست 1960، ص 239 بحوالہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے: طاہر تونسوی

40 ماہنامہ کتاب، لکھنؤ، دسمبر 1968

تحقیق

مسعود حسن رضوی ادیب کا شمار اردو کے بڑے محققوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق طرح طرح کے موضوعات کو محیط ہے۔ انھوں نے فائز، میر، غالب اور انیس وغیرہ سے متعلق اہم، معتبر اور کارآمد معلومات فراہم کیے، مرثیے کی تاریخ کی طرف توجہ کی اور اس کے مواد کی جمع آوری کا مشکل مرحلہ سر کیا، مرثیوں کی تخلیق کے زمانوں اور ان کے متون کی صحیح ترین صورتوں سے واقف کرایا۔ اردو ڈرامے کی ابتدا کے زمانے کا تعین کیا اور اودھ میں اردو ڈرامے کی بنا اور اس کے ارتقا کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ اودھ بالخصوص لکھنؤ کی تہذیب وثقافت، یہاں کے علوم وفنون اور یہاں کے تہذیبی اور ادبی محرکات کا اس حد تک مطالعہ کیا کہ انھیں لکھنویات کا ماہر کہا جانے لگا۔

'انیس'، 'مرثیہ' اور 'لکھنویات' ان کی تحقیق کے خاص موضوع تھے۔ ان موضوعات کی طرف مائل ہونے کے وجوہ اور ان میں سند کی حیثیت حاصل ہوجانے کے بارے میں ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں:

> ''[ادیب] کی نانی میر انیس کے خاص شاگرد میر سلامت علی مرثیہ خواں لکھنوی کی بیٹی اور خود بھی اہلِ زبان تھیں... میر عبدالعلی نے ادیب کو حساب کے علاوہ مرثیہ خوانی بھی سکھائی تھی۔ میر عبدالعلی کے یہاں میر انیس اکثر آتے رہتے تھے اور خود ان کا میر انیس کے گھر میں آنا جانا تھا۔ میر عبدالعلی کے نانا میر انیس کے یہاں داروغہ اور ایک اور عزیز بھی انیس کے یہاں ملازم تھے۔ ادیب میر عبدالعلی سے انیس کے واقعات سنا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے میر عبدالعلی سے حاصل ہونے والی معلومات کو اپنے ایک بہت اہم مضمون 'میر انیس کے کچھ چشم دید حالات' میں استعمال کیا۔ ان بزرگوں کی وجہ سے

انیس اور صنفِ مرثیہ کے ساتھ ادیب کا تعلق خاطر فطری بات تھی۔ لڑکپن ہی میں انھوں نے فرمائش کر کے اپنے لیے انیس کے کئی مرثیوں کی نقلیں تیار کرائیں اور آگے بڑھ کر انیس شناسوں اور مرثیے کے محققوں میں سرفہرست آ گئے۔''(1)

لکھنؤ اور واجد علی شاہ سے ادیب کی دل چسپی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''لکھنؤ کی طالب علمی کے ... دور نے ایک طرف ادیب کے ادبی ذوق کو جلا بخشی، دوسری طرف ان کو اِس مٹتے ہوئے شہر اور اس کی ختم ہوتی ہوئی ادبی اور تہذیبی روایات نے مسحور کرنا شروع کیا۔ ان کی ملاقات بہت سے ایسے لوگوں سے ہوئی جنھوں نے اپنی آنکھ سے واجد علی شاہ کا زمانہ اور 1857 کا آشوب دیکھا تھا۔ ان سب کے پاس دل چسپ اور عبرتناک حکایتوں کا ایک خزانہ تھا جس سے ادیب یہاں تک متمتع ہوئے کہ اپنی ادبی زندگی میں انھوں نے واجد علی شاہ اور لکھنویات پر خصوصی توجہ کر کے ان دونوں موضوعات پر سند کی حیثیت حاصل کر لی۔''(2)

مسعود حسن رضوی تحقیق کی اہمیت اور اس کے وقار و اعتبار کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مطلوبہ اور متعلقہ مواد کو جمع کس طرح کیا جاتا ہے، اس کی ترتیب و تنظیم کا طریقہ کیا ہے، صحیح ماخذ تک پہنچنے اور متن کی صحیح صورت کو سامنے لانے کے لیے کتنی محنت اور مہارت کی ضرورت ہے، ناقص یا نامکمل متن کی تصحیح کے اصول و آداب کیا ہیں نیز دوسرے کی تحقیق پر شک کرنے اور اپنی دریافت کو درست بتانے کا استدلالی طریقہ کیا ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود تحقیق سے ان کی گہری وابستگی اور ان کے منظم طریقِ کار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بعض اوقات آدھی رات کو سوتے سوتے چونک کر انھیں کسی عبارت یا

---

1 سید مسعود حسن رضوی ادیب (حیات اور کارنامے) مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی جنوری 93، ص 27

2 ایضاً، ص 28

حوالے کے سلسلے میں کوئی خلش پیدا ہوتی اور وہ اسی وقت بستر سے اٹھ کر کسی الماری میں سے متعلقہ کتاب نکالتے اور دیکھتے تھے۔ اپنے ذخیرے کی ہزاروں کتابوں میں سے ہر کتاب کی ظاہری ہیئت اور ٹھکانہ ان کے حافظے میں موجود رہتا تھا۔

بالعموم وہ ایک ساتھ کئی کئی موضوعات پر کام کرتے تھے اور ہر موضوع کا مواد تلاش کر کے اکٹھا کرتے رہتے تھے... مواد کی فراہمی کا یہ کام برسوں تک جاری رہتا اور اس طرح بعض کتابوں کی تکمیل میں انھیں بیس پچیس برس یا اس سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا تھا۔ آخر جب ان کو محسوس ہوتا کہ اب کسی موضوع سے متعلق کافی مواد جمع ہوگیا ہے تب وہ کتابی صورت میں اس کی ترتیب شروع کرتے۔

منتشر مواد کو ایک منظم کتاب کی شکل دینے اور اسے مناسب ابواب و مباحث میں تقسیم کرنے کو وہ تحقیقی کام کے مشکل ترین مرحلوں میں شمار کرتے اور اس میں غیر معمولی محنت اور مہارت صرف کرتے تھے... ادیب فراہم شدہ مواد اور اس سے دستیاب معلومات کو بار بار دیکھ کر اسی کی مدد سے کتاب کا نظم درست کرتے تھے۔''(3)

اس طرح مسعود حسن رضوی نے صحیح اور معیاری تحقیق کے آداب وشرائط کا لحاظ رکھا۔ دیوانِ فائز کی ترتیب، سلطانِ عالم واجد علی شاہ، فیضِ میر اور اردو ڈرامہ اور اسٹیج وغیرہ تصنیفات ان کی تحقیق کے اعلیٰ اور مثالی نمونے ہیں۔ یہاں ان کی تحقیق کے مختلف میدانوں سے متعلق تصنیفوں کی مختصر تفصیل پیش کی جارہی ہے:

میریات

فیضِ میر:

یہ فارسی میں لکھا ہوا وہ رسالہ ہے جو بقول میر ''انھوں نے اپنے بیٹے فیض علی کی تعلیم

3 سید مسعود حسن رضوی ادیب (حیات اور کارنامے) مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی جنوری 93، ص 34-33

کے لیے لکھا اور اس وجہ سے اس کا نام 'فیضِ میر' رکھا۔'' بہت زمانے تک تذکرہ نگاروں اور محققوں کی رسائی اس رسالے تک نہیں ہوسکی۔ 'سراپا سخن' میں میر کی تصنیفوں کے ذکر میں ایک رسالے کا نام 'میر فیض' بتایا گیا ہے۔ آزاد نے آبِ حیات میں 'فیضِ میر' کا صرف نام لیا ہے۔ ادیب نے اسے مرتب کر کے سولہ صفحات کے مقدمے کے ساتھ نظامی پریس، لکھنؤ کے زیرِ اہتمام پہلی بار 1939 میں شائع کیا۔ اس کی دوسری اشاعت اسی مطبع کے زیرِ اہتمام فہرستِ مضامین فرہنگ اور اشاریے کے ساتھ 1964 میں ہوئی۔ رسالے کا اصل متن 24 صفحے میں ہے اور ترجمہ سولہ صفحے میں۔ اس طرح پوری کتاب چھپن صفحات پر مشتمل ہے۔

آبِ حیات میں اس کا ذکر آنے کے بعد آزاد کے معترضین نے اس کے موجود ہونے پر شبہ ظاہر کیا۔ مسعود حسن رضوی نے 'فیضِ میر' کی دریافت کے بعد اس شبہ پر اپنے ردِ عمل کا اظہار اس طرح کیا:

> ''میر تقی میر کے بارے میں آزاد کی بہت سی مفروضہ غلط بیانیاں دکھائی جا چکی ہیں۔ ان ہی کی تصانیف میں آزاد نے 'رسالہ فیضِ میر' کو بھی شمار کیا ہے جس وقت یہ رسالہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا، اس وقت تک وہ آزاد کا تصنیف کیا ہوا افسانہ تھا۔ آج یہ رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اب دیکھیے وہی افسانہ ایک حقیقت بن گیا۔''[4]

اس رسالے کی دستیابی کی داستان بڑی دل چسپ ہے۔ مسعود حسن کو تلاش 'ذکرِ میر' کی تھی اور اسی کی جستجو میں میر کی تین نایاب تصنیفیں ان کے ہاتھ لگ گئیں۔ لکھتے ہیں:

> ''ایک دن ایک شخص چند پرانی کتابیں بیچنے کے لیے آیا۔ میں نے ان پر ایک نظر ڈالی۔ ان میں سے ایک قلمی نسخہ تھا جس پر 'ذکرِ میر' لکھا ہوا معلوم ہوا۔ جلدی جلدی باقی کتابوں کو الٹا پلٹا اور سب کتابوں کی مجموعی قیمت ادا کر کے کتاب فروش کو رخصت کیا۔ اب اس قلمی نسخے کو غور سے دیکھا تو اس میں شک نہ رہا کہ یہ وہی 'ذکرِ میر' ہے جس کو میری آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ کتاب کے

---

4 فیضِ میر۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب 1929، ص 2

ورق الٹنا شروع کیے۔ ذکرِ میر ختم ہوگئی تو میر کا رسالہ 'فیضِ میر' نظر آیا۔ اس کی
ورق گردانی ختم ہوئی تو میر کا فارسی دیوان دکھائی دیا۔ میر کی تین تین نایاب
تصنیفیں گھر بیٹھے ایک ساتھ مل گئیں۔"[5]

'فیضِ میر' کا جو نسخہ مسعود حسن کے ہاتھ لگا وہ بدخط بھی تھا اور کرم خوردہ بھی۔ رسالے کے متن کو پڑھنے کی پوری کوشش کے باوجود اس میں بعض لفظ مشتبہ رہ گئے۔ مسعود حسن کو رام پور میں کسی صاحب کے پاس اس کے ایک اور نسخے کے موجود ہونے کی خبر ملی۔ مسعود نے ان صاحب تک پہنچنے کی پوری کوشش کی لیکن مالک رسالہ نے اپنا نام پوشیدہ رکھا اور مسعود حسن اس نسخے سے اپنے نسخے کا مقابلہ کیے بغیر رام پور سے مایوس لوٹ آئے۔ اپنے تحقیقی مواد کی صحت کو شک و شبہہ سے بالا رکھنا مسعود کے تحقیقی مزاج کی مجبوری تھی اسی لیے انھوں نے اتنی تگ و دو کی۔ کامیابی نہ ملنے کی صورت میں انھوں نے اپنے پاس موجود نسخے کو امکان بھر تصحیح کے ساتھ شائع کردیا۔

رسالہ 'فیضِ میر' میں پانچ حکایتیں ہیں جن کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مسعود حسن لکھتے ہیں:

"ان (حکایتوں) کی روشنی میں میر کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے اور واضح ہوجاتا ہے کہ شاعروں کے پیر حضرتِ میر ایک فقیر صفت بزرگ تھے، صوفی درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دلجوئی کو فرضِ انسانیت سمجھتے تھے... تصوف اور الٰہیات کے مسائل سے میر کو بڑی دل چسپی تھی۔ وہ ان کو غور سے سنتے اور سمجھتے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے... 'فیضِ میر' ان کی سیرت کی سچی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے صوفیوں کا اندازِ طبیعت، پروازِ خیال اور طرزِ کلام بھی خوب سمجھ میں آتا ہے۔"[6]

---

5 میری ادبی زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعات وشخصیات۔
نشریہ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ 20 ستمبر 1960

6 فیضِ میر۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب 1929، ص 12-11

فارسی زبان پر میر کی غیر معمولی قدرت کا اعتراف کرتے ہوئے مسعود حسن لکھتے ہیں:

> ''فیضِ میر' فارسی میں ہے اور فارسی بھی ایسی جس کا سمجھنا بہت آسان نہیں ہے۔ اس کتاب کی نفع رسانی کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے اس کا خلاصہ اردو میں لکھا جاتا ہے۔ یہ خلاصہ کیا ہے کتاب کا آزاد ترجمہ ہے جس میں کہیں کہیں ایسے فقرے اور جملے چھوڑ دیے گئے ہیں جو صرف تزئینِ کلام کا فائدہ دیتے ہیں۔''(7)

اس طرح مسعود حسن نے اس رسالے کی زبان کی خصوصیتوں اس کے اسلوب کی ندرتوں اور اس میں بیان کی ہوئی حکایتوں کی معنویتوں کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔

غالبیات

میر ہی کی طرح غالب سے بھی مسعود حسن رضوی کو گہری محبت تھی۔ اپنی تعلیم کے ابتدائی زمانے ہی سے غالب ان کے مطالعے میں تھے۔ اپنی اہم ترین تصنیف 'ہماری شاعری' میں بھی انھوں نے اپنے مطالب کی وضاحت کے لیے غالب کے شعروں سے مدد لی۔ ان شعروں کی شرح سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود حسن میں شعر فہمی کا زبردست ملکہ تھا۔ یہ ملکہ غالب ہی کے شعروں کی شرح سے حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ غالب کی شاعری سے شعر فہمی کی تربیت ملتی ہے۔ مسعود حسن نے غالب کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ غالب کی نظم و نثر کو سمجھنے پر قادر تھے۔ مسعود حسن رضوی نے غالب پر کوئی ضخیم اور مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن بقول نیر مسعود: ''اپنے زمانے میں ادیب بھی غالب سے متعلق کچھ بہت اہم مواد پہلی بار منظرِ عام پر لائے جس کی وجہ سے ان کا شمار ماہرینِ غالبیات میں ہونے لگا۔'' کتابچوں اور مضامین کی شکل میں مسعود نے جو کچھ لکھا ہے وہ غالب شناسی میں اہم اضافہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مرتب کی ہوئی دو مختصر کتابوں کا تعارف ضروری ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب ہے 'متفرقاتِ غالب' اور دوسری 'شرحِ طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب'۔

---

7 فیضِ میر۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب 1929، ص 16

'متفرقاتِ غالب' پہلی بار 1947 میں رام پور سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1969 میں کتاب نگر، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن 189 صفحات کا ہے جس میں 36 صفحوں کا مقدمہ شامل ہے۔ اس مقدمے میں کتاب میں شامل تحریروں کے پس منظر اور ان کے شانِ نزول کے بارے میں ثبوتوں اور حوالوں کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ خود مرتب نے کتاب کی غرضِ اشاعت پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''مرزا غالب کے غیر مطبوعہ اور نادر مکتوبات و منظومات کا یہ مجموعہ جو 'متفرقاتِ غالب' کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، غالب کے قدر دانوں کے لیے خاص دل چسپی کا باعث ہوگا اور غالب کی حیات، سیرت اور شخصیت کے بارے میں بہت سا نیا مواد فراہم کر دے گا۔''(8)

کتاب کے مشتملات سے متعارف کراتے ہوئے مسعود حسن لکھتے ہیں:

> ''میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے، جس میں مرزا غالب کے اڑتالیس فارسی خط، دو فارسی قطعے، ایک فارسی مثنوی اور ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ یہ کل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتے میں مقیم تھے۔ اور یہ سب نظمیں ایسی ہیں جو غالب نے کلکتے کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی کلکتے کے رہنے والے ہی نے یہ تمام چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں۔
>
> اس بیاض میں جو خط شامل ہیں وہ ایک کے سوا سب فارسی میں ہیں اور ان میں آخر کے بیس خط مرزا ابوالقاسم خاں قاسم کے نام ہیں۔ ان خطوں سے پہلے قاسم کا ایک قطعہ غالب کے نام اور غالب کے دو قطعے قاسم کے نام ہیں...
>
> بقیہ خطوں کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے اکیس خط مولوی سراج الدین احمد کے نام، چھ خط مرزا احمد بیگ خاں کے نام اور ایک خط ادارۂ جامِ جہاں نما کے نام ہے۔''(9)

آگے چل کر مقدمے میں ان خطوں کی تصنیف کے اسباب پر تفصیل سے اظہارِ خیال

---

8 متفرقاتِ غالب: طبعِ دوم 1969، ص 8-7

9 ایضاً، ص 9-8

کیا گیا ہے۔

شرحِ طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب :

یہ مختصر سی کتاب 1973 میں کتاب نگر، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ کتاب کے عنوان ہی سے کتاب کے مضمون کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ مسعود حسن رضوی نے اپنے مختصر سے پیش نامے میں کتاب کے تعارف میں لکھا ہے :

> ''غالب کے اردو دیوان کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں ان میں مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی کی شرح کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ مولانا ایک مسلم الثبوت عالم، شاعر اور ناقد تھے۔ وہ دیوانِ غالب کی شرح میں کلامِ غالب کی تشریح و تفہیم کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کرتے گئے ہیں۔ ان کے مختصر لیکن انتہائی اہم تنقیدی بیانات شرح کے ساڑھے تین سو صفحوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں ہے۔ راقم نے ان کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ان منتشر بیانات کو محاسنِ کلام اور معائب کلام کے دو بابوں میں مناسب عنوانوں کے تحت جمع کردیا ہے۔''[10]

یہ کتاب اس معنیٰ میں اہم ہے کہ اس میں غالب کے شعروں کی شرحوں کے ضمن میں طباطبائی نے شرح و تعبیر کے بعض اہم نکات کو نمایاں کیا ہے۔

غالب اور تنقیدِ غالب سے متعلق ان مختصر کتابوں کی ترتیب کے علاوہ مسعود حسن رضوی نے غالب کی سوانح، شخصیت اور شاعری سے متعلق کچھ اہم مضامین بھی تحریر کیے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

(1) مرزا غالب کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اور اس کی شانِ نزول

الناظر، لکھنؤ دسمبر 1934

(2) مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی

زمانہ کانپور۔ مارچ۔ اپریل 1946

---

10 شرحِ طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب مطبوعہ 1973 پیش نامہ

(3) غالب کے دو تعزیت نامے اور چتا جان

ماہِ نو کراچی، فروری 1949

(4) غالب کے حالات میں پہلا مضمون

مشمولۂ احوالِ غالب: مرتبہ مختارالدین آرزو

(5) خطوطِ مشاہیر بنام ولایت وعزیز صفی پوری۔ شاگرد غالب

مشمولہ عیارِ غالب مرتبہ مالک رام

(6) فکرِ غالب (غالب کے ایک شعر کی شرح)

ماہنامہ کتاب، لکھنؤ مارچ 1969

(7) مرزا غالب۔ تب اور اب

ماہنامہ کتاب، لکھنؤ اپریل 1969

(8) غالب کے ایک قصیدے پر واجد علی شاہ کا عطیہ

ہماری زبان، علی گڑھ 22 ستمبر 1971

(9) غالب کا ایک فارسی خط

تحریک، دہلی مئی 1962

(10) غالب کا ایک خط اور غالب کے نام دو خط

نیا دور، لکھنؤ جنوری 1974

تبصرے:

(1) قتیل اور غالب از سید انور علی آفریدی

(2) ذکرِ غالب از مالک رام

(3) لطائفِ غالب مولفہ مسز اے۔ ایم۔ شاہ

لکھنویات

مسعود حسن رضوی کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ لکھنوی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کی شخصیت اسی تہذیب کی آئینہ دار تھی۔ لکھنؤ سے اپنی دلی محبت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے لکھنؤ سے، اس مرحوم لکھنؤ سے جو ہمارے علوم و فنون کا سرچشمہ، ہماری تہذیب و تمدن کا مرکز اور ہماری زبان و ادب کا ٹکسال تھا، قلبی محبت ہے اور اس کی علمی و ادبی خدمتوں کو منظرِ عام پر لانے میں مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔''(1)

لکھنوی تہذیب سے اسی والہانہ عشق کی بنا پر مسعود حسن نے ضروری جانا کہ وہ اس تہذیب میں پوشیدہ نورانی عناصر کی جستجو کریں اور دنیا کو اس سے واقف کرائیں۔ چنانچہ انھوں نے اودھ کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ جانب دار مورخوں نے سیاسی مصالح کی بنا پر اپنے معاندانہ تجزیوں اور یکطرفہ نتیجوں کے ذریعے اودھ کی تاریخ کے منفی رخوں کو دکھا کر اسے مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے اس کی تہذیب و ثقافت کے اصل اور اہم عناصر پردۂ خفا میں رہ گئے ہیں۔ ان جانب دار مورخوں نے اودھ کے آخری فرماں روا سلطانِ عالم واجد علی شاہ کو اپنی تنقید کا سب سے زیادہ نشانہ بنایا تھا اور ان کے بارے میں وثوق و اعتماد کے ساتھ ایسی من گھڑت باتیں لکھ ڈالی تھیں کہ واجد علی شاہ ایک بے عمل اور عیش پسند بادشاہ بن کر رہ گئے تھے۔

سلطانِ عالم واجد علی شاہ

مسعود حسن رضوی نے اس تصور کو غلط ثابت کرنے کی غرض سے واجد علی شاہ پر

1 شاعر۔ آگرہ۔ دسمبر 1948 ص 9 بحوالہ طاہر تونسوی

باقاعدہ تحقیق شروع کی اور برسوں کی محنت کے بعد ایسے ماخذوں تک رسائی حاصل کی اور ایسا تحقیقی مواد جمع کیا جو واجد علی شاہ کی صحیح اور سچی تصویر کو سامنے لاتا ہے۔ اپنے تحقیقی سرمائے کو کتابی صورت میں پیش کرنے سے قبل مسعود حسن رضوی نے واجد علی شاہ کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں سے متعلق مختلف رسائل و جرائد میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ ان مضامین کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

(1) اردو کا پہلا ڈراما نگار: ہماری زبان، علی گڑھ 22 جون 1967
(2) واجد علی شاہ کی ایک مناجات: نیا دور، لکھنؤ اگست 1965
(3) مثنوی عشق نامہ: مصنفہ واجد علی شاہ، ہماری زبان، علی گڑھ، 15 جنوری 1966
(4) نواب یا بادشاہ: ہماری زبان، علی گڑھ 8 اپریل 1966
(5) مدرسۂ قیصریہ، مٹیا برج بنا کردہ واجد علی شاہ: ہماری زبان، علی گڑھ یکم دسمبر 1966
(6) سلطان واجد علی شاہ: انسان، مصنف شاعر: مشمولہ نذرِ مقبول۔ مرتبہ خیر بہوروی 1970
(7) واجد علی شاہ آخری بادشاہِ اودھ (انگریزی): سووینیر اودھ کلچرل کلب، لکھنؤ 1972
(8) واجد علی شاہ (انگریزی): سووینیر لکھنؤ کلچرل ایسوی ایشن ستمبر 1974

درج بالا مضامین میں 'سلطان واجد علی شاہ۔ انسان، مصنف، شاعر' ایسا مضمون ہے جو چھیاسٹھ صفحات کو محیط ہے اور کتاب سلطانِ عالم واجد علی شاہ دراصل اسی مضمون کی توسیع ہے۔ مسعود حسن رضوی نے واجد علی شاہ سے متعلق مواد کو جمع کرنے میں تیس برس صرف کیے تھے۔ اس طویل مدت میں اپنے مواد کی جمع آوری اور اس مواد کو کتاب کی صورت میں لانے سے متعلق مسعود حسن رضوی اپنے اسی مضمون کے سرنامے میں لکھتے ہیں:

> ''اودھ کے آخری مظلوم بادشاہ کے خلاف غرض مند پروپیگنڈہ بازوں کے گھڑے ہوئے بے بنیاد افسانے تو آپ نے بہت سنے ہوں گے۔ اب ادبی تحقیق کے ایک صحرا نورد کی زبان سے تھوڑی سی حقیقت بھی سن لیجیے، کیا عجب ہے کہ لایعنی تصورات کا غبار چھٹ جائے اور عیاشی اور عیش پرستی کا ایک مجموعہ انسانیت اور شرافت کا پیکر نظر آنے لگے۔ یہ مقالہ صرف ایک مختصر تعارف ہے۔

اگر اس ستر سال کے بوڑھے ادیب کی زندگی نے وفا اور تندرستی نے رفاقت کی
تو شاید کثیر المقدار تحقیقی مواد کا کوئی اور حصہ بھی منظرِ عام پر آجائے۔''(2)

مسعود حسن رضوی کا یہ خواب ان کے انتقال کے دو سال بعد اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوا جب یہ کتاب 1977 میں میرا کادمی، لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ یہ کتاب 331 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تصنیف میں 255 ماخذوں سے کام لیا گیا ہے جن کی فہرست کتاب کے مشتملات کی فہرست کے بعد ہی دے دی گئی ہے۔ کتاب کے مواد کی جمع آوری کے بارے میں مسعود حسن رضوی نے ہماری زبان، علی گڑھ کے 22 اکتوبر 1967 کے شمارے میں ایک مراسلہ لکھ کر اپنے پاس موجود کتابوں کی فہرست درج کی تھی اور صاحبانِ علم و تحقیق سے گزارش کی تھی کہ جو کتابیں ان کے علم میں ہوں، ان سے وہ مراسلہ نگار کو مطلع فرمائیں۔ اس فہرست میں 53 کتابیں ایسی تھیں جو مسعود حسن کے کتب خانے میں موجود تھیں اور تیرہ کتابیں ایسی تھیں جن کا مطالعہ انھوں نے پٹنہ اور کلکتے کے کتب خانوں میں کیا تھا۔

مسعود حسن رضوی نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ بادشاہ کے ابتدائی حالات، طبعی خصوصیات اور ادبی خدمات سے متعلق ہے اور دوسرے حصے میں بادشاہ کی مظلومی، معزولی اور جلا وطنی کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کے دیباچے میں کتاب کے مقصد اور طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

''بیشتر کتابوں میں بادشاہ کے حالات انگریزوں کے بیانات سے لیے گئے ہیں جو بادشاہ کے کھلے ہوئے مخالف تھے۔ اس کتاب میں ہندستانیوں کے بیانات سے بہت کچھ لیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کی رعایا، ان کے اہلِ ملک ان کو کیا سمجھتے تھے۔ جو بیانات پیش کیے گئے ہیں وہ ایسے لوگوں کے ہیں جو بادشاہ کے ہم عصر یا قریب العہد تھے لیکن جو نہ شاہی منصب دار تھے نہ وظیفہ خوار اور جنھوں نے بادشاہ کی معزولی اور جلا وطنی کے

---

2 نذرِ مقبول۔ مرتبہ خیر بہوروی، ص 3

بعد کوئی کتاب لکھی یا کوئی رائے ظاہر کی ہے۔ یعنی جن کے لیے بادشاہ کی خوشامد میں غلط بیانی کرنے سے کوئی فائدہ متصور نہ تھا۔''[3]

پھر لکھتے ہیں:

''انگریز واجد علی شاہ کے حالات اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی حکومت اودھ والوں کے لیے ایک مصیبت تھی۔ انگریزوں نے انھیں معزول کرکے اودھ کے لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دی۔ پیشِ نظر کتاب سے واضح ہوگا کہ اس بادشاہ کو اپنی رعایا میں کتنی ہردل عزیزی بلکہ محبوبیت حاصل تھی۔''[4]

پھر کتاب کے اعتبار واستناد کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''کتاب میں کوئی بات بغیر مستند حوالوں کے نہیں کہی گئی ہے۔ اس قید نے مصنف کے کام کو بہت دشوار اور دیرطلب بنا دیا۔ تاریخ نگار اکثر کسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر واقعات میں رنگ آمیزی اور قطع و برید کردیتا ہے۔ اس بنا پر راقم نے تاریخی ماخذوں سے زیادہ ان غیرتاریخی ماخذوں پر اعتماد کیا ہے جن میں واقعات کا بے غرض اور بے لوث بیان ملتا ہے۔''[5]

مسعود حسن نے شدید محنت اور طویل جستجو کے بعد یہ کتاب لکھ کر واجد علی شاہ کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو روشن کیا ہے جنھیں تاریخ دانوں بالخصوص مغربی تاریخ دانوں نے جان بوجھ کر اندھیرے میں رکھا تھا تاکہ وہ بادشاہ کے بارے میں غلط باتیں پھیلا کر لوگوں کو گمراہ کرسکیں۔ مسعود حسن نے اس کتاب میں حقائق کی جستجو کی ہے اگرچہ ان پر بھی عقیدت اور جانبداری کے الزامات عائد کیے گئے۔

●

3 سلطانِ عالم واجد علی شاہ۔ مسعود حسن رضوی ادیب مطبوعہ 1977، ص 20

4 ایضاً، ص 20

5 ایضاً، ص 21

لکھنؤ اور لکھنوی تہذیب سے مسعود حسن رضوی کی قلبی محبت کا ذکر کیا جاچکا ہے اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ اس محبت کا سبب کیا تھا۔

لکھنؤ پر اگر چہ بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن جس وثوق، تفصیل اور اعتماد کے ساتھ مسعود حسن رضوی نے لکھنؤ پر قلم اٹھایا، اس نے ہمیں اصل اور مکمل لکھنؤ سے متعارف کرادیا۔ مسعود حسن نے لکھنوی تہذیب و ثقافت اور یہاں کے ادبی و تہذیبی خدمات پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی لیکن ان کے مختلف مضامین اور دوسرے عنوانات کے ماتحت ان کی دوسری کتابوں میں لکھنؤ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ یہ تحریریں لکھنوی ادب و تہذیب کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہیں اور ان سے گذشتہ اور موجودہ لکھنؤ کا متحرک منظر نامہ مرتب ہوتا ہے۔

لکھنویات سے متعلق مسعود حسن رضوی کے مضامین کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

(1) لکھنؤ کے شاہی کتب خانے اور مطبعے (غدر سے پہلے): ادبی دنیا، نوروز نمبر 1932

(2) لکھنوی ادب کا سماجی پس منظر، شاہانِ اودھ کا مذہب: ریڈیو لکھنؤ، نشریہ 17 اکتوبر 1971

(اس مضمون پر نظر ثانی کر کے اس کا عنوان 'ارد ادب پر شاہانِ اودھ کے مذہبی رجحانات کا اثر' رکھا ہے۔)

(3) آج کل کا لکھنؤ: ریڈیو لکھنؤ، نشریہ 11 مارچ 1942

(4) لکھنوی ادب کا سماجی پس منظر: واجد علی شاہ کا اثر: غیر مطبوعہ

(5) اودھ کے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عناصر: نیا دور، لکھنؤ جولائی 1956

(6) اردو ڈراما اور دربارِ اودھ: آج کل ڈرامہ نمبر، جنوری 1959

(7) لکھنؤ میں اردو ناٹک کی ابتدا: مشمولہ گپت ابھی نندن گرنتھ 1966

(8) شہروں کی کہانی: لکھنؤ۔ غیر مطبوعہ

(9) لکھنؤ کے نقوشِ ماضی: پیامِ نو، لکھنؤ 21-14 جون 1970

(10) لکھنؤ کا شاہی کتب خانہ : نیادور، لکھنؤ، اگست 1970

(11) شاہی دسترخوان کے کھانے : نوائے ادب، بمبئی، 15 اپریل 1974

○

ڈراما

لکھنوی تہذیب اور واجد علی شاہ کی شخصیت سے خصوصی دل چسپی کی بنا پر مسعود حسن رضوی کا رہس اور ناٹک کی اس روایت کی طرف فطری طور پر متوجہ ہونا ضروری تھا جس کی بنا اودھ میں سب سے پہلے واجد علی شاہ نے ڈالی تھی۔ ناٹک یا رہس ہندستانی ثقافت کی ایک روشن روایت ہے اور مسعود حسن اس کی ادبی اور ثقافتی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اس روایت کے ادبی اور ثقافتی پہلو سے متعارف کرانا ان کا ادبی فریضہ تھا بالخصوص اس روایت سے جس کی خشتِ اوّل لکھنؤ میں رکھی گئی اور جو یہیں پروان چڑھی۔

پروفیسر احتشام حسین کے ساتھ اپنی ایک گفتگو اور 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' کے دیباچے میں مسعود حسن اس روایت کو اپنا موضوع بنانے کا جواز پیش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح 1924 میں محمد عمر۔ نور الٰہی صاحبان نے 'ہندستان کا ڈراما' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر افواہوں اور قیاسوں کی بنیاد پر 'اندرسبھا' کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کو راہ دی۔ اور جب عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالے 'دلگداز' میں ایک مضمون لکھ کر ان غلط فہمیوں کو غلط ٹھہرایا تو ان دونوں صاحبان نے شرر کی ردّ میں ایک مقالہ لکھا اور چند روز بعد ڈرامے پر اپنی ایک مبسوط کتاب 'ناٹک ساگر' لکھ کر مکرر وہی باتیں لکھیں جو شرر کی ردّ والے مقالے میں لکھ چکے تھے۔ شرر نے چونکہ محمد عمر۔ نورالٰہی صاحبان کے بیانوں کا بطلان دلیلوں اور ثبوتوں کے ساتھ نہیں کیا تھا اس لیے مسعود حسن کو" ضرورت محسوس ہوئی کہ اصل حقیقت مضبوط ثبوت کے ساتھ پیش کی جائے۔" اس مقصد کے تحت انھوں نے 'اندرسبھا اور شرح اندرسبھا' کے عنوان سے 1926 میں ایک مقالہ لکھا جو 1927 میں رسالہ 'اردو' میں شائع ہوا۔ اور اسی کے بعد مسعود حسن اردو ڈرامے میں خصوصی دل چسپی لینے لگے۔ اس دل چسپی میں

غیر معمولی اضافہ اس وقت ہوا جب انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر اودھ کے شاہی اسٹیج کے مختلف پہلوؤں پر پانچ تقریریں تیار کیں جو 1943 کی مختلف تاریخوں میں بالاقساط نشر کی گئیں۔اس کے بعد اردو ڈراما اور اسٹیج کا ابتدائی دور مسعود حسن کی تحقیق کا خاص موضوع بن گیا۔

محمد عمر۔نورالٰہی صاحبان نے اپنی کتاب 'ہندستان کا ڈراما' میں جن غلط باتوں کو صحیح ٹھہرایا تھا وہ یہ تھیں کہ اندرسبھا اردو کا پہلا ڈراما ہے۔ وہ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے قلم سے لکھا گیا، شاہی محل میں کھیلا گیا اور خود بادشاہ اور اس کے درباریوں نے اس میں پارٹ کیا۔

مسعود حسن رضوی نے دلیلوں کے ساتھ نہ صرف ان باتوں کو غلط بتایا بلکہ اردو کے پہلے ڈراما نگار اور اردو کے پہلے ڈرامے کے بارے میں دوسرے محققین کے نتائج کو بھی غلط ثابت کیا اور واجد علی شاہ کو ثبوتوں کے ساتھ اردو کا پہلا ڈراما نگار قرار دیا۔ مسعود حسن نے اپنی تحقیق سے برآمد نتائج کو دو کتابوں کی شکل میں پیش کیا جو 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' اور 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' کے عنوان سے 1956 اور 1957 میں شائع ہوئیں۔ پھر یہ دونوں کتابیں ملا کر 1957 میں ایک ساتھ شائع کی گئیں اور دو الگ الگ کتابوں کے اس مجموعے کا نام قرار پایا۔

اردو ڈراما اور اسٹیج

اس نام کے قرار پانے کا قصہ بھی بہت دل چسپ ہے جسے ڈاکٹر نیر مسعود اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''اردو ڈراما اور اسٹیج کی تاریخ کے سلسلے میں انھوں نے واجد علی شاہ کے رہس/رادھا کنہیا کا قصہ/اُن کے تصنیف اور اسٹیج کیے ہوئے دوسرے ڈراموں اور امانت کی اندرسبھا پر کام مکمل کرکے اسے دو مستقل کتابوں کی صورت دے دی تھی، لیکن ابھی ان کے پاس قدیم ڈرامے کے مختلف عناصر کے بارے میں بہت سا بیش قیمت اور ضروری مواد منتشر صورت میں جمع تھا جس کی تنظیم کا کوئی

مناسب نقشہ ان کے ذہن میں نہیں آرہا تھا اور اس اہم مواد سے کام لیے بغیر کتاب تیار کردینے پر ان کا دل آمادہ نہیں تھا، اس لیے انھوں نے دونوں کتابوں کی طباعت برسوں تک روکے رکھی۔ آخر ایک دن رات کو سوتے سوتے کسی خواب نما کیفیت میں ان پر اچانک اس پوری تاریخ کی ترتیب مع نام کتاب منکشف ہوگئی اور انھوں نے اسی وقت اٹھ کر کتاب کا مکمل خاکہ بنالیا۔ وہ خود کہتے تھے کہ ان کو زندگی میں ایسی خوشی بہت کم ہوئی تھی جیسی اس مکاشفے سے ہوئی۔ اب ان کے اس تحقیقی کام کا مجموعی نام 'اردو ڈراما اور اسٹیج: ابتدائی دور کی مفصل تاریخ' ہے ادیب نے اس کے ابواب و مباحث کی تقسیم اس طرح رکھی ہے کہ ان میں وہ سارا مواد خوش ترتیبی کے ساتھ کھپ گیا ہے جو انھوں نے کئی دہائیوں کی تلاش اور تگ و دو سے جمع کیا تھا اور کئی برس تک اس کی ترتیب میں پریشان رہے تھے۔''[1]

'اردو ڈراما اور اسٹیج' کی پہلی کتاب کا نام ہے: 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'۔ یہ کتاب 240 صفحات کو محیط ہے۔ اس کی تصنیف میں مسعود حسن رضوی نے اردو اور انگریزی کے 72 ماخذوں سے کام لیا ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ مباحث کی موضوعی ترتیب قائم رہے۔ نویں باب یعنی ضمیمے میں افرادِ قصہ کی تفصیل کے ساتھ واجد علی شاہ کے لکھے ہوئے اردو کے پہلے ڈرامے 'رادھا کنہیا کا قصہ' کا پورا متن موجود ہے اور اسی متن کے تعارف کے طور پر ایک پیش نامہ ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ بہت اہم ہے جس میں کتاب کے مصنف نے واجد علی شاہ کے مختصر حالات، ان کی علمی استعداد، سیرت، فنونِ لطیفہ سے ان کی دل چسپی، فنِ موسیقی کی سرپرستی، ناٹک کی قدر افزائی، سبھا ناٹک یعنی صدرِ جلسہ یا بانیِ محفل کی شخصیت وغیرہ موضوعات پر اختصار اور جامعیت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے اور آخر میں کتاب کے سببِ تالیف کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

---

1 سید مسعود حسن رضوی کی ادبی زندگی: نیر مسعود۔ مشمولہ سید مسعود حسن رضوی ادیب — حیات اور کارنامے۔ مرتبہ نذیر احمد 1993، ص 35-34

''جو کوئی اس موضوع (واجد علی شاہی ڈراما اور اسٹیج) پر لکھنے بیٹھا اس نے کچھ نئی غلط فہمیوں کا اضافہ کردیا۔ ان لکھنے والوں کی نیک نیتی میں شبہ نہیں، مگر ان سے یہ شکایت ضرور ہے کہ انھوں نے تحقیق کی ذمہ داریوں کو ملحوظ نہیں رکھا اور ماخذوں کی تلاش اور مواد کی فراہمی میں سہل انگاری سے کام لیا۔

...اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے راقمِ حروف نے ماخذوں کی تلاش و دستیابی اور مواد کی فراہمی و ترتیب میں برسوں کا وقت صرف کرکے اردو ڈراما اور اسٹیج کے پہلے دور کی مستند تاریخ تیار کردی ہے۔''(2)

دیباچے کے بعد پس منظر کے عنوان سے کتاب کے پہلے باب میں ڈرامے کی ابتدا، ناٹک کی صداقت، ناٹک کا مقصد، ابھنے یا ہندستان کی قدیم اداکاری، ناٹک کا زوال، رام لیلا اور رہس، قصہ خوانی، بھانڈوں کی نقلوں، بھگت بازوں، بہروپیوں اور داستان گوئی، نقالی اور بہروپ کی ڈرامائی حیثیت وغیرہ موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں نصیرالدین حیدر کے شاہی ڈرامے کے ابتدائی آثار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں جلسے والیوں، لفظ جلسے کے مفہوم، راگنیوں کے جلسوں، راگ مالاؤں، انسانی روپ میں راگ راگنیوں اور نصیرالدین حیدر کے تفریحی مشغلوں پر گفتگو کی گئی ہے اور نصیرالدین حیدر کے بعد کی صورتحال کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

تیسرا باب 'شاہی اسٹیج کے معمارِ اعظم' واجد علی شاہ سے متعلق ہے۔ اس میں واجد علی شاہ کی ولادت، بچپن، ان کے دادا اور باپ کی بادشاہی اور ان کے پریوں کے مکتب اور پری خانے کا بیان ہے۔

چوتھے باب میں شاہی اسٹیج کی ارتقائی منزلوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی منزل میں واجد علی شاہ کے جوگی بننے سے متعلق باتوں کا بیان ہے۔ دوسری منزل میں واجد علی شاہ کے ایجادی رہس کی حقیقت، اس کے تصور، اس کی مختلف صورتوں، طرزوں اور ہدایتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اورتیسری منزل میں واجد علی شاہ کی ولی عہدی کے زمانے میں ہونے والے رہس کے جلسوں کا بیان ہے۔ ان میں پہلے جلسے کی تیاری، پہلے

2 اردو ڈراما اور اسٹیج۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، مطبوعہ 1957 ص 24-23

شاہی ناٹک، ناٹک کے پلاٹ، ناٹک کے تماشائی، رہس کے اداکاروں، ان کی پوشاکوں اور اس زمانے کا ذکر ہے جب یہ ناٹک پہلی بار کھیلا گیا۔ پھر اس وقفے کا بیان ہے جب تخت نشینی کے بعد پری خانہ ویران ہوگیا تھا اور بیماری کے زمانے میں بادشاہ کے ناچ گانے سے تائب ہوجانے کی وجہ سے ان جلسوں کو موقوف کردیا گیا تھا۔ یہ وقفہ گزر جانے اور توبہ کی شکست کے بعد چوتھی منزل میں عہدِ شاہی میں رہس کے تین جلسوں کا تفصیلی بیان ہے۔ ان میں سے پہلا جلسہ وہ ہے جس میں بادشاہ نے اپنی مثنوی 'دریائے تعشق' کو ڈرامے کا روپ دیا۔ دوسرے جلسے میں بادشاہ کی مثنوی 'افسانۂ عشق' کے ڈرامے کا ذکر ہے جس میں سیم تن اور ماہ پیکر کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اور تیسرا جلسہ وہ ہے جسے بادشاہ کی مثنوی بحرِ الفت سے ترتیب دیا گیا تھا۔

اس کے بعد شاہی رہس کے ساز و سامان کا بیان ہے اور اردو ڈرامے کے پہلے تھیٹر یا تماشا خانے (جسے واجد علی شاہ نے قیصر باغ کی شاہ منزل میں قائم کیا تھا) کا ذکر کرنے کے بعد پانچویں منزل میں قیصر باغ کے اس جوگیا میلے کا ذکر ہے جس کے بارے میں مسعود حسن نے لکھا ہے:

> ''واجد علی شاہ کی پیدائش کے وقت سے ان کی والدہ جوتشیوں کی ہدایت کے مطابق ہر سال ان کو جوگی بنایا کرتی تھیں اور یہ سالانہ رسم محل کے اندر انجام دی جاتی تھی۔ واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں اس رسم کو رقص و سرود کے جلسے میں تبدیل کردیا، جس میں قریبی عزیزوں اور مخصوص مصاحبوں کو بھی شرکت کی اجازت تھی۔ بادشاہ ہونے کے بعد بھی چند سال تک یہ جلسہ اسی طرح ایک نجی صحبت کی صورت میں ہوتا رہا۔ 1269ھ میں واجد علی شاہ نے اس کو ایک میلے کی شکل دے کر سارے شہر کو شرکت کی دعوت دی۔ یہ میلہ قیصر باغ میں ساون کے مہینے میں ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ کے جوگی بننے کی رسم سے اس کی بنیاد پڑی تھی اور اس میں شریک ہونے والے سب لوگ گیروئے رنگ کے فقیرانہ کپڑے پہنتے تھے۔''[3]

---

3 اردو ڈراما اور اسٹیج۔ (پہلی کتاب)، ص 184

اگلے باب میں 'خلطِ مبحث' کے عنوان سے شاہی رہس کے اس بیان سے بحث کی گئی ہے جو اودھ میں اسسٹنٹ کمشنر ولیم نائٹن نے اپنی کتاب 'الٰہی جان کی کہانی' میں شاہی محل کی ایک خادمہ الٰہی جان سے سن کر لکھا ہے۔ اس بیان میں ''واجد علی شاہ کے جوگی بننے کی رسم، قیصر باغ کا جوگیا میلہ، غزالہ ماہ رو کا قصہ اور واجد علی شاہ کی ایک مصنوعی شاہِ جن سے ملاقات یہ سب چیزیں مخلوط ہوگئی ہیں۔'' مسعود حسن رضوی کے خیال میں :

> ''اس خلطِ مبحث کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ باتیں الٰہی جان کو غلط یاد رہیں، کچھ اس نے غلط بیان کیں اور کچھ نائٹن صاحب نے غلط سمجھیں... نائٹن نے ان منتشر اور متفرق باتوں میں ربط پیدا کرکے ان کو ایک مسلسل بیان کی صورت میں پیش کردیا۔''[4]

کتاب کا آخری باب 'کلکتے میں شاہی رہس' سے متعلق ہے جس میں بادشاہی سے واجد علی شاہ کی محرومی کے بعد کلکتے میں ان کے قیام کے دوران غم غلط کرنے کی غرض سے کھیلے جانے والے جلسوں کا ذکر ہے۔

اس طرح یہ کتاب لکھنؤ کے شاہی اسٹیج کا ایک مکمل اور معتبر خاکہ پیش کرتی ہے۔ مسعود حسن رضوی نے اس خاکے کو مرتب کرنے کے لیے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مواد کی جمع آوری کی ہے اور لکھنؤ کے شاہی اسٹیج سے متعلق ہر پہلو کا احاطہ کرلیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہم لکھنؤ میں کھیلے جانے والے رہس اور ناٹک سے متعلق ہر چیز سے واقف ہوجاتے ہیں۔ جزئیات کی یہ تفصیل ہمیں اور کہیں نہیں ملتی۔

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج

264 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا موضوع امانت کی اندرسبھا ہے۔ 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' پر گفتگو کرتے وقت بتایا جاچکا ہے کہ مسعود حسن لکھنؤ کے شاہی اور عوامی اسٹیج کی طرف کیوں متوجہ ہوئے۔ اس کے پیچھے امانت کی اندرسبھا کا قضیہ ہے۔ اس ڈراما کے بارے میں عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ یہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جسے شاہی محل میں کھیلا جاتا

4 اردو ڈراما اور اسٹیج۔ (پہلی کتاب)، ص 209-208

تھا اور اس کے کھیل میں واجد علی شاہ خود اندر کا پارٹ کرتے تھے۔ یہ غلط فہمیاں عام تھیں۔ مسعود حسن کا مقصد یہ تھا کہ ثبوتوں کی جستجو کی جائے اور بتایا جائے کہ یہ باتیں غلط اور گمراہ کن ہیں۔ اسی لیے انھوں نے طویل تحقیق کے بعد معتبر حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ اندر سبھا اردو کا پہلا ڈراما نہیں ہے۔ 'لکھنؤ کا شاہی اسٹیج' لکھ کر جہاں انھوں نے بہ حیثیت ڈراما نگار واجد علی شاہ کی اولیت کو ثابت اور اہمیت کو اجاگر کیا وہیں 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' لکھ کر یہ بتایا کہ اندر سبھا اگر چہ اردو کا پہلا باضابطہ ڈراما نہیں ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت و مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ان کے لفظوں میں :

''اندر سبھا اردو کا پہلا ڈراما نہیں ہے لیکن اس سے اس کی تاریخی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو عوامی اسٹیج کے لیے لکھا اور کھیلا گیا۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جس کو عام مقبولیت نے شہر شہر اور اودھ میں گاؤں گاؤں پہنچا دیا۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو چھپ کر منظر عام پر آیا اور سینکڑوں مرتبہ شائع ہوا۔ وہ اردو کا پہلا ڈراما ہے جو ناگری گجراتی اور مرہٹی خطوں میں بھی چھاپا گیا اور اس کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا گیا۔''[5]

آگے لکھتے ہیں :

''اندر سبھا کی تاریخی اہمیت تو مسلم تھی ہی، رفتہ رفتہ اس کی ادبی اہمیت بھی مسلّم ہوتی گئی اور اس کا ایک مستند ایڈیشن مقدمے اور حاشیوں کے ساتھ شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔''[6]

اندر سبھا کی اسی تاریخی اور ادبی اہمیت کے پیشِ نظر مسعود حسن رضوی نے نہ صرف اس کا معتبر ترین متن شائع کیا بلکہ اس کی ادبی اور لسانی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا اور اسٹیج ڈراما کی حیثیت سے اس کے رموز کو روشن کیا۔ اس گرانقدر تصنیف کی تیاری میں انھوں نے اردو کے 74 اور انگریزی کے پانچ ماخذوں سے مدد لی۔

کتاب کی ابتدا میں امانت کی سوانح اور ان کے تصنیفی سرمائے وغیرہ کا ذکر کیا گیا

---

5 اردو ڈراما اور اسٹیج۔ (دوسری کتاب)، ص 11

6 ایضاً، ص 12

ہے۔ پھر ان کی خاص خصوصیت رعایتِ لفظی کا جائزہ لیتے ہوئے مثالاً وہ اشعار نقل کیے گئے ہیں جن میں یہ رعایت موجود ہے۔ اسی رعایت کی بنا پر امانت کے دیوان کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ 'موجدِ رعایتِ لفظی' لکھا گیا ہے۔ امانت کی مرثیہ گوئی اور نثر نگاری کا محاکمہ کرتے ہوئے اندرسبھا کے سببِ تالیف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر لفظ رہس کا توسیعی مفہوم بتاتے ہوئے اندرسبھا کو بھی اس کے دائرے میں لے آیا گیا ہے۔ اندرسبھا کے سالِ تصنیف اور اس کے قدیم ایڈیشن پر گفتگو کرنے کے بعد اندرسبھا کے ماخذ و مقامات (جن کے نام قصے میں آئے ہیں)، اس کی زبان اور اس کھیل کی نوعیت کے بارے میں بتایا گیا ہے نیز اس کھیل پر ایک تقابلی نظر ڈالی گئی ہے۔ اگلے صفحات میں اسٹیج کے سازوسامان اور پوشاکوں وغیرہ کا ذکر ہے اور اندرسبھا کی مقبولیت اور اسی طرز کے دوسرے ناٹکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد اندرسبھا کے مفہوم میں اس توسیع کا ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے تتبع میں لکھی جانے والی کتابیں بھی اندرسبھا کہلانے لگیں، بقیہ صفحات میں اندرسبھا کے مصنف کی زبانی اس کی شرح بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد مسعود حسن رضوی کے ساتھ اندرسبھا کا متن دیا گیا ہے۔ آخر میں ضمیمۂ کتاب میں اندرسبھا کی زبان کے صوتی، صرفی، نحوی اور لفظی اختلافات بیان کیے گئے ہیں۔

●

اردو ڈراما اور اسٹیج اگرچہ بنیادی طور پر مسعود حسن کا تحقیقی کارنامہ ہے لیکن انھوں نے شاہی اور عوامی اسٹیج سے متعلق اپنی تحقیقات کو اپنے محاکموں کے ساتھ اس طرح مرتب کیا ہے کہ ہم اس عہد میں ڈرامے کی روایت اور اس کی معنویت سے پوری طرح واقف ہوجاتے ہیں۔ خالص تحقیقی کارنامے کی حیثیت سے مسعود حسن کی اس کتاب کی اہمیت و افادیت بہت زیادہ ہے۔ اہم ماخذوں تک رسائی حاصل کرنا، ان کے بیانات کا مقابلہ کرنا اور ان میں سے اصل حقیقت کو سامنے لانا نیز منتشر معلومات کو تاریخی اور زمانی تسلسل کے

ساتھ پیش کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن مسعود حسن رضوی کی دیدہ وری اور عرق ریزی نے اسے معنوی تنظیم کے ساتھ انجام تک پہنچایا اور اس طرح پہنچایا کہ یہ کتاب اردو ڈرامے کے ابتدائی دور کی مستند تاریخ بن گئی اور اس کے بیانات کا اعتبار آج بھی قائم ہے۔

اندر سبھا

مسعود حسن رضوی نے 1968 میں اندر سبھا کے متن کو پیش نامے اور مقدمے کے ساتھ ایک علاحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1981 میں شائع ہوا۔ مسعود حسن کے مرتب کیے ہوئے اس ایڈیشن سے قبل سیّد وقار عظیم اور ممتاز منگلوری نے بھی 1959 اور 1966 میں اندر سبھا کو شائع کیا تھا۔ دونوں مرتبین نے اپنے ایڈیشنوں کے مقدمات میں نام لیے بغیر مسعود حسن رضوی کے وہی بیانات نقل کر دیے ہیں جو اندر سبھا سے متعلق 'لکھنؤ کا عوامی اسٹیج' میں موجود ہیں۔

مسعود حسن نے اندر سبھا کے پیش نامے میں امانت کی زندگی میں شائع ہونے والی اندر سبھا کی تینوں ترتیبوں کے فرق کی مختصر نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے دوسری اور تیسری ترتیب پر مصنف (امانت) نے نظر ثانی بھی کی۔ اندر سبھا کی دوسری ترتیب امانت کی نظرِ ثانی اور تصحیح کے بعد چھاپی گئی تھی۔ علاحدہ کتاب کی صورت میں مسعود حسن کے مرتب کیے ہوئے اندر سبھا کے ایڈیشن کے مقدمے میں اختصار کے ساتھ وہی باتیں کہی گئی ہیں جو لکھنؤ کا عوامی اسٹیج میں موجود ہیں۔

بزمِ سلیمان

امانت لکھنوی کی اندر سبھا کے مقبول ہونے کے بعد اسی طرز پر اور بہت سے ناٹک لکھے گئے۔ ان میں مداری لال کی اندر سبھا، بھیروں سنگھ عظمت کی جشنِ پرستاں اور خادم حسین افسوس کے ناٹک بزمِ سلیمان کو اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ناٹک بزمِ سلیمان کا ایک نسخہ مسعود حسن کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔ انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ پہلے اس کی ایک نقل خود تیار کی پھر اسے کاتب

سے لکھوایا۔ اس بارے میں لکھتے ہیں :

''یہ نسخہ اس قدر رختہ اور مندرس ہے اور اس کی کتابت کا انداز ایسا ہے کہ اس کو صحیح پڑھنا اور اس کے اشعار کو صحیح ترتیب سے نقل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ میں نے بہت دیدہ ریزی کے ساتھ آنکھوں سے زیادہ دماغ سے کام لے کر پہلے اس کو خود نقل کیا، پھر کاتب سے لکھوایا۔''(7)

اس کے بعد مسعود حسن رضوی نے اس ناٹک کو مرتب کر کے اپنے تحقیقی مقدمے کے ساتھ رسالہ نقوش، لاہور کے اگست 1969 کے شمارے میں شائع کیا۔ اس تحقیقی مقدمے میں مرتب نے ناٹک کے مصنف کے بارے میں لکھا ہے :

''منشی خادم حسین کے حالاتِ زندگی معلوم نہیں۔ ان کی نظم و نثر کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معمولی استعداد کے ذہین آدمی تھے ... موسیقی میں دخل رکھتے تھے اور گیت بنانے اور ان کی دھنیں رکھنے پر قادر تھے ... ان کے قلم سے نکلی ہوئی جو چیزیں میرے علم میں آئی ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے۔ چھ قطعات تاریخ، اکیس گیت، پریم ساگر کا خاتمہ اور ناٹک بزمِ سلیمان۔''(8)

اپنے عالمانہ مقدمے میں مسعود حسن رضوی نے اس ناٹک کی خوبیوں اور خصوصیتوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کو بھی دور کیا ہے نیز افسوس کے بارے میں سوانحی معلومات بھی فراہم کیے ہیں۔

---

7 سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات و خدمات۔ مولفہ مرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ 1977 ص 213

8 ایضاً، ص 213

رثائیات و انیسیات

مرثیے سے مسعود حسن رضوی کی دل چسپی کے بارے میں ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں:

''ان کی نانی میر انیس کے خاص شاگرد میر سلامت علی مرثیہ خواں لکھنوی کی بیٹی اور خود اہلِ زبان تھیں۔ وہ ادیب کو غلط یا غیر فصیح زبان بول جانے پر ٹوکتی رہتی تھیں۔ نانی کے بھائی میر عبدالعلی نے ادیب کو حساب کے علاوہ مرثیہ خوانی بھی سکھائی تھی۔ میر عبدالعلی کے یہاں میر انیس اکثر آتے رہتے تھے اور خود ان کا میر انیس کے گھر میں آنا جانا تھا۔ میر عبدالعلی کے نانا میر انیس کے یہاں داروغہ اور ایک اور عزیز بھی انیس کے یہاں ملازم تھے۔ ادیب عبدالعلی سے انیس کے واقعات سنا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے میر عبدالعلی سے حاصل ہونے والی معلومات کو اپنے ایک بہت اہم مضمون 'میر انیس کے کچھ چشم دید حالات' میں استعمال کیا۔ ان بزرگوں کی وجہ سے انیس اور صنفِ مرثیہ کے ساتھ ادیب کا تعلق خاطر فطری بات تھی۔ لڑکپن ہی میں انھوں نے فرمائش کرکے اپنے لیے انیس کے کئی مرثیوں کی نقلیں تیار کرائیں اور آگے بڑھ کر انیس شناسوں اور مرثیے کے محققوں میں سرفہرست آگئے۔''[1]

نیر مسعود کے بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مسعود حسن رضوی کو انیس اور صنفِ مرثیہ سے کیوں اور کس حد تک دل چسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے شروع ہی سے رثائی ادب سے متعلق کتابوں، مسودوں، قلمی نسخوں اور بیاضوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ عمر بھر ان کی تعداد میں اضافہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس صنفِ مرثیہ اور اس کے متعلقات کا ایک بڑا اور نایاب ذخیرہ جمع ہوگیا۔ مرثیے کے شائقین ان کے اس ذخیرے کو

---

1 سید مسعود حسن رضوی کی ادبی زندگی۔ نیر مسعود۔
سید مسعود حسن رضوی ادیب: حیات اور کارنامے۔ مرتبہ نذیر احمد 1993، ص 27

رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مرثیے کی صنف میں اپنی اہم تحقیقوں اور اس صنف کے قیمتی سرمایے کا مالک ہونے کی وجہ سے رثائیات کے میدان میں مسعود حسن کا مدِ مقابل کوئی نہیں ہے۔

اردو مرثیوں کے ساتھ ساتھ مسعود حسن رضوی نے فارسی مرثیوں کو بھی جمع کیا اور اپنی تحریروں میں ان مرثیوں کی تاریخ سے متعارف اور ان کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اردو مرثیے پر مسعود حسن نے جتنا بھی کام کیا وہ مرثیے کی تاریخ و تحقیق کے لیے راہ نما ثابت ہوا۔ مرثیے کی تاریخ و تعارف سے متعلق یوں تو ان کی کئی تحریریں ہیں لیکن ان میں تین بہت اہم ہیں۔ دو مضامین کی شکل میں اور ایک کتاب کی صورت میں۔ ان کی ترتیب اس طرح ہے:

(1) شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں (مراثیِ ریختہ)
(2) تاریخِ مرثیہ کا ایک باب عہد محمد شاہ (1161۔ 1131ھ)
(3) دلّی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور

مراثیِ ریختہ

'مراثیِ ریختہ' کتابی شکل میں آنے سے قبل مضمون کی صورت میں (مرثیوں کے متن کی شمولیت کے بغیر) رسالہ تحریر، نئی دہلی (اپریل۔ جون 1971) میں شائع ہو چکا تھا۔

کتاب کے پیش لفظ میں کتاب کے ناشر و مرتب اظہر مسعود رضوی لکھتے ہیں:

''مراثیِ ریختہ کے ایک مجموعے کے دو قلمی نسخے والدِ مرحوم کے کتب خانے میں موجود تھے۔ اس بیاض پر انھوں نے ایک طویل مقدمہ سپردِ قلم کیا تھا جو رسالہ تحریر، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو مقدمے کے طور پر شامل کر کے ان کا ارادہ 'مراثیِ ریختہ' کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا تھا۔ یہ کتاب اسی طرح شائع کی جا رہی ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ پہلے تمام مرثیہ گویوں کے حالات اور فرہنگ مقدمے کے ساتھ مسلسل تھے اب ہر مرثیہ گو کے حالات اس کے مرثیوں سے پہلے درج کر دیے گئے ہیں اور فرہنگ کتاب کے آخر میں

دے دی گئی ہے۔''[2]

'مراثیِ ریختہ' 1984 میں یعنی مضمون کی شکل میں اشاعت کے تیرہ سال بعد کتابی صورت میں کتاب نگر، لکھنؤ کے زیرِاہتمام شائع ہوئی۔ مقدمۂ کتاب میں مسعود حسن کتاب میں شامل مرثیوں کی دستیابی اور ان کے زمانۂ اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں :

''راقمِ حروف کے عظیم ذخیرۂ مراثی کے نوادر میں شمالی ہند کے قدیم ترین اردو مرثیوں کا ایک کافی ضخیم مجموعہ ہے، جس کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ کامل ہے، دوسرا دونوں طرف سے ناقص ہے۔ کامل نسخے کا بھی سرورق غائب ہے۔ اس لیے نہ اس مجموعے کا نام معلوم ہوسکا نہ اس کے مولّف کا۔ لیکن اس کے ایک سے زیادہ نسخوں کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ کسی شخص کی نجی بیاض نہیں ہے بلکہ ایک مستقل کتاب ہے۔''[3]

مسعود حسن رضوی کے بقول اس مجموعے کو بیاض قرار دینے والا کاتب کوئی شخص محمد مراد ہے اور اس کی کتابت محمد شاہ کے زمانے میں ہوئی۔ 'مراثیِ ریختہ' میں شامل کل مرثیوں کی تعداد 152 ہے لیکن فی الحقیقت ایک سو پچاس ہے۔ ان میں 113 مرثیے اردو میں اور 37 مرثیے فارسی زبان میں ہیں۔ ان مرثیوں کی قدامت کے بارے میں مسعود حسن بتاتے ہیں :

''اس میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ مرثیہ گو میر جعفر سے قدیم تر ہیں اور غالباً گیارہویں صدی ہجری سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں گزرے ہیں گویا ان کے مرثیے شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں ہیں۔''[4]

مقدمے کے مزید حصے میں مسعود حسن رضوی نے ان مرثیوں کی ہیئت، ان کے مضامین، ان کی تصنیف کے عہد میں عزاداری، ان کی زبان اور ان کے رسمِ خط کا جائزہ لیا ہے۔ مراثیِ ریختہ میں شامل مرثیوں کی ہیئتوں کے بارے میں مسعود حسن لکھتے ہیں :

---

2 مراثیِ ریختہ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ مطبوعہ 1984، ص 6

3 ایضاً ص 17

4 ایضاً ص 25

''اردو کے 113 مرثیے جو اس جلد میں شامل ہیں ان میں سے ایک مثلث، دو مثنوی، چھ مربع گیارہ مخمس اور ۹۳ قصیدے کی شکل کے ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اتنے مرثیوں میں مسدس ایک بھی نہیں ہے۔''(5)

مراثیِ ریختہ لکھنے کے بعد مسعود حسن رضوی نے اپنے ایک اہم مضمون 'تاریخِ مرثیہ کا ایک باب۔عہدِ محمد شاہ' میں مراثیِ ریختہ کے بعد کے دور کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد شاہی عہد سے پیشتر کے مرثیہ گویوں کا خطاب خواص سے تھا۔ اس عہد کے مرثیہ گویوں کے مخاطب عوام ہیں اس لیے وہ عوامی زبان میں مرثیہ کہتے ہیں۔ یہی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد سے پیشتر کے مرثیوں میں بالعموم واقعاتِ کربلا کی طرف صرف اشارے ملتے ہیں۔کسی واقعے کا اجمالی بیان بھی نہیں ملتا۔ اس عہد کے مرثیوں میں واقعات کا بیان بھی اختصار کے ساتھ کیا جانے لگا۔''(6)

اس مضمون میں یک رنگ، حاتم، انسان، فضلی، کرم علی، مسکین، حزین و غمگین، خلیل، آثمی، ہوشدار، ندیم، احسان اور ظہور کے مرثیوں کے نمونے مرثیہ نگاروں کے مختصر حالاتِ زندگی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

مرثیے کی تاریخ سے متعلق مسعود حسن رضوی کی تیسری اہم تحریر 'دہلی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور' ہے۔ اس مضمون کے آخر میں مسعود حسن نے مرثیے کے مختلف ادوار پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''شمالی ہند میں اس وقت شاعری اور مرثیہ گوئی کا مرکز دہلی تھا اور مرثیہ اپنی تاریخ کے تین دوروں سے گزر چکا تھا۔ پہلا دور محمد شاہ کے عہد سے پہلے ختم ہوگیا ... دوسرا دور محمد شاہ کے طویل تقریباً تیس سالہ عہد کے ساتھ شروع ہوا اور اسی پر ختم ہوا۔ مرثیہ گوئی کا تیسرا دور سودا سے شروع ہوکر دہلی کی شعری مرکزیت کے ساتھ ختم ہوا۔ سودا کی اصلاحی تحریک نے مرثیے میں بھی ان تمام

---

5 مراثیِ ریختہ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ مطبوعہ 1984، ص 26

6 ارمغانِ مالک۔ مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص 110

اصول و قواعد کی پابندی لازم کر دی جو دوسرے اصنافِ سخن میں ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ اس طرح مرثیے میں وہ ادبی شان پیدا ہو گئی جس نے ترقی کرتے کرتے انیس و دبیر کے سے فنکار پیدا کر دیے اور مرثیے کو اردو شاعری کی ایک اہم صنف بنا دیا۔''(7)

اس طرح مسعود حسن رضوی نے اردو مرثیے کی تاریخ کو ایک کتاب اور دو مضمونوں کے ذریعے مربوط و مرتب کر دیا ہے۔ یہ تینوں تحریریں تین مختلف ادوار کو محیط ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہم نہ صرف مرثیے کے تاریخی سلسلے کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ مرثیے کی زبان اور اس کی ہیئت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔ مرثیے کے بعد کے محققین نے اردو مرثیے کی تاریخ کو مرتب کرنے کے سلسلے میں اس تاریخی سلسلے سے بہت مدد لی۔

اردو اور فارسی مرثیے سے متعلق مسعود حسن رضوی کے دوسرے مضامین کی تفصیل اس طرح ہے:

(1) ایران میں مرثیہ گوئی کی ابتدا و چند مرثیہ گو۔ مشمولہ روئداد۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور 1928

(2) قاچاری عہد میں ایران میں عزاداری۔ پیامِ اسلام، لکھنؤ، دسمبر 1946

(3) ایران کی محرمی شبیہیں یا تعزیے۔ سرفراز، لکھنؤ۔ اکتوبر 1948

(4) ایران میں عزاداری اور مرثیہ گوئی (صفوی عہد سے پہلے) پیامِ اسلام، لکھنؤ، اکتوبر 1948

(5) مقبل اصفہانی۔ پیامِ لکھنؤ، جون۔ جولائی 1965

(6) ایرانیوں کا مقدس ڈراما، نسیم بکڈپو، لکھنؤ 1966

اردو مرثیہ:

(1) قطب شاہی عہد کی عزاداری، سرفراز محرم نمبر، لکھنؤ 1936

7 تحریر، نئی دہلی۔ اکتوبر تا دسمبر۔ 1973، ص 38

(2) سلامِ الفت، سرفراز، لکھنؤ 1947

(3) حیدری مرثیہ گو، نیا دور، لکھنؤ۔ اگست 1963

(4) کرم علی مرثیہ گو، تحریر، نئی دہلی، جنوری۔ مارچ 1967

(5) مسکین مرثیہ گو، آج کل، نئی دہلی۔ مئی 1967

(6) تاریخِ مرثیہ کا ایک باب۔ عہد محمد شاہ۔ مشمولہ ارمغانِ مالک 1971

(7) دلگیر مرثیہ گو کا مذہب اور ہندوؤں کے اسلامی نام۔ نیا دور، لکھنؤ جولائی 1972

(8) دلّی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور، تحریر، نئی دہلی۔ اکتوبر۔ دسمبر 1973

(9) ناتک مرثیہ گو، نیا دور، لکھنؤ۔ اپریل 1974

(10) 'مراثیِ ریختہ' تحریر، نئی دہلی۔ اپریل۔ جون 1974

متفرقات :

(1) واقعۂ کربلا اور اس کے نتائج۔ ادب، لکھنؤ مئی 1931

(2) حسینی قربانی اور اس کی یادگار، لکھنؤ ریڈیو نشریہ 16 اگست 1942

(3) حسینی اخلاق۔ 'کوکب' جولائی 1926

(4) محمد علی شاہ بادشاہ کا ایک خواب، پیامِ نو، لکھنؤ۔ جون۔ جولائی 1968

انیسیات

لڑکپن کے زمانے سے ہی انیس سے مسعود حسن رضوی کے تعلقِ خاطر کے بارے میں نیر مسعود کا اقتباس نقل کیا جا چکا ہے۔ مسعود حسن نے آخرِ عمر تک انیس سے اپنے اس تعلق میں کمی نہ آنے دی۔ لیکن انیس سے ان کی عقیدت برائے عقیدت نہ تھی۔ وہ انیس کو ان کے شعری کمالات کی وجہ سے ایک بڑا شاعر اور مرثیہ گویوں میں سب سے بڑا مرثیہ گو سمجھتے تھے۔ شبلی کے بعد مسعود حسن رضوی ہی وہ ادیب ہیں جنھوں نے انیس کی شاعری کے مختلف اور منفرد پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ انیس پر ترتیب دی ہوئی ان کی کتابیں اور ان کتابوں کے مقدمات و حواشی انیس کی شاعری کی اہمیت و معنویت کو سمجھنے میں ہماری

رہنمائی کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ انیس کے مرثیوں کے مختلف نسخوں کے مقابلوں کے ذریعے ان مرثیوں کے متن کی صحیح صورتوں کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ یہ کام بہتر طور پر وہی کر سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس انیس کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس طرح انھوں نے خالص علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے انیس کو سمجھا اور انیس شناسی کا حق ادا کیا۔ بقول مالک رام:

> ''انیس کے ہم عصر انیسیوں اور مسعود صاحب میں ایک فرق تھا۔ جن لوگوں نے انیس کی زندگی میں ان کی حمایت کا اعلان کیا، انھوں نے ان کی زبان، پڑھنے کے انداز اور مرثیے کے دروبست کو پسند کرکے ایسا کیا تھا۔ یہ حمایت بہت حد تک جذباتی تھی۔ وہ اپنی ذات تک بے شک مطمئن تھے کہ اپنے حریفوں کے مقابلے میں انیس بہتر مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں۔ لیکن اگر ان سے دریافت کیا جاتا کہ انیس کی عظمت کے کیا اسباب ہیں، انھوں نے مرثیے کے ذریعے سے علم و ادب کی کیا خدمت کی ہے، ان کے مرثیوں کی فنی خوبیاں کیا ہیں تو یقیناً وہ ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر رہتے۔''[8]

مالک رام نے مسعود حسن رضوی کی انیس پسندی کا علمی جواز پیش کیا ہے۔ مسعود حسن رضوی نے اپنی تحریروں میں انیس کی شاعری کے ہر پہلو کو روشن کیا ہے۔ ترتیب و تصنیف کی شکل میں انیس پر مسعود حسن کی چھ کتابیں ہیں جن کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

روحِ انیس

روحِ انیس کے اب تک چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1926 میں شائع ہوا تھا اور چھٹا 1981 میں۔ چھٹا یعنی آخری ایڈیشن 239 صفحات کو محیط ہے۔ اس میں انیس کے سات نمائندہ مرثیے پندرہ سلام اور پینتیس رباعیات شامل ہیں۔ کتاب میں پانچ عنوانوں کے ماتحت پانچ مقدموں میں واقعۂ کربلا اور اس کے اسباب و نتائج کے بارے میں بتایا گیا ہے، میرانیس کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں اور ان کے کلام پر مختصر

8 ماہنامہ آج کل۔ نئی دہلی۔ فروری 1976، ص 24

تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان مقدموں کے بارے میں مسعود حسن اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''انیس کے کلام کو بخوبی سمجھنے کے لیے کربلا کے خونیں واقعے کے تفصیلات، اشخاصِ مرثیہ کے حالات، شاعر کے معتقدات و مسلمات، جو لوگ اس کے براہِ راست مخاطب تھے ان کے خیالات وجذبات اور مرثیے کے لوازم وخصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اسی غرض سے چند مقدمے کتاب میں شامل کیے جارہے ہیں۔''[9]

یہ کتاب انیس کی سوانح، ان کے موضوع کے پس منظر، اس موضوع کی معنویت اور انیس کے محاسنِ شعری کو جاننے اور سمجھنے میں کامل رہنمائی کرتی ہے۔ ایک ایسا قاری جس نے محض انیس کا نام سن رکھا ہے لیکن واقعۂ کربلا کی تاریخی اہمیت، اس کے وقوع پذیر ہونے کے سبب اور اس واقعے کے مختلف وقوعوں اور کرداروں سے واقف نہیں ہے، روحِ انیس کو پڑھ کر اس واقعے کے تاریخی اور معنوی جزئیات سے واقف ہوجاتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ انیس نے اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا اور ان کے شاعرانہ کمال کا سبب کیا ہے۔ اس کتاب میں انیس کے درج ذیل مرثیے شامل ہیں:

(1) بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حر
(2) جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج
(3) جب رن میں سر بلند علی کا علم ہوا
(4) کیا غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے
(5) جب نوجواں پسر شہِ دیں سے جدا ہوا
(6) نمکِ خوانِ تکلّم ہے فصاحت میری
(7) جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

شاہکارِ انیس

یہ کتاب میر انیس کے اس معرکہ آرا مرثیے کا مصوّر ایڈیشن ہے جس کا مطلع ہے: ع

---

9 روحِ انیس۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ 1981، دیباچہ ص 6

جب قطع کی مسافت شبِ آفتاب نے۔ مسعود حسن رضوی نے اپنے طویل مقدمے اور کثیر التعداد توضیحی اور تنقیدی حاشیوں کے ساتھ اسے مرتب کیا اور نظامی پریس، لکھنؤ نے 1943 میں اس کا نہایت نفیس، باتصویر اور بیش قیمت ایڈیشن شائع کیا۔ اس مرثیے کے 197 بندوں کی انتہائی عمدہ کتابت اس زمانے کے نامور خطاط مرزا محمد جواد نے کی اور اس کی طباعت کا التزام یوں کیا گیا کہ ہر صفحے پر ایک بند سنہری نقوش سے مزیّن حاشیے کے درمیان ہلکے زرد رنگ کی زمین پر جلی حروف سے لکھا گیا۔ مرثیے کے اہم واقعات کی تصویر کشی اس وقت کے ممتاز مصور سید حسن عسکری نے چھ مرقعوں کی شکل میں کی جنھیں اپنے اپنے مقام پر ایک علاحدہ صفحے کی صورت میں لگا دیا گیا۔ اس طرح اپنے صوری حسن کے اعتبار سے اپنے زمانے میں یہ میر انیس کے شاہکار مرثیے کا شاہکار مرقع قرار پایا۔ مسعود حسن رضوی کے علاوہ سید احتشام حسین، اختر علی تلہری، سر تیج بہادر سپرو، شیخ ممتاز حسین جونپوری نے اپنے گرانقدر مضامین سے اس کتاب کے معنوی حسن میں اضافہ کیا۔ انیس کی پیدائش کے دو سو سال مکمل ہونے پر اسی مرثیے کو اسی کتابت اور صفحہ بہ صفحہ طباعت کے اسی انداز کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے بہت عمدہ کاغذ پر جہازی سائز میں شائع کیا جس میں پورے مرثیے کا انگریزی اور کچھ بندوں کا عربی ترجمہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مرقعِ ثانی کا محرک مرقعِ اوّل کو قرار دیا ہے اور مرقعِ اول کے مرتّب کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور کتاب کا انتساب بھی انھیں کے نام کیا ہے۔

مسعود حسن رضوی نے اس کتاب کے مقدمے میں مرثیے کی تفصیل کو اکیس شقوں میں سمیٹ کر نہ صرف اس کا خلاصہ بیان کیا ہے بلکہ واقعۂ کربلا کے مختلف مرحلوں کے بیان میں جزئیات کے انتخاب میں انیس کے کمال اور ان کی قدرتِ بیان کو ظاہر کیا ہے نیز اس مرثیے کے شاہکار ہونے کے ثبوت میں ان پہلوؤں کی خصوصیت کو نمایاں کیا ہے جو انیس کے دوسرے مرثیوں میں موجود تو ہیں لیکن اس طرح موجود نہیں ہیں۔

مسعود حسن نے مقدمے کے ابتدائی کلمات ہی میں اس مرثیے کی خصوصیت اور انفرادیت کو ظاہر کر دیا ہے:

''اس مرثیے کے بارے میں دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر حیثیت سے اور تمام مرثیوں سے بہتر ہے مگر اس میں کچھ ایسی خصوصیتیں ضرور ہیں کہ اگر کوئی شخص انیس کا صرف ایک ہی مرثیہ پڑھنا چاہتا ہے تو اس کو اس مرثیے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس مرثیے میں پورا معرکۂ کربلا مختصراً پیش کردیا گیا ہے۔ اس میں انیس کے ہر طرح کے کلام کے نمونے موجود ہیں اور انیس کی شاعری کے بیشتر محاسن جمع ہیں.... جنھوں نے مختلف مرثیہ گویوں کا کلام نہیں دیکھا ہے اور خود انیس کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کرکے وہ زاویۂ نگاہ اور وہ اندازِفکر پیدا نہیں کرلیا ہے جو کلامِ انیس کے محاسن کو بخوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے، وہ بھی اس مرثیے سے لطف اٹھا سکتے ہیں اور انیس کی شاعری کے بلند مرتبے کا کسی قدر اندازہ کرسکتے ہیں۔''(10)

رزم نامۂ انیس

اس کتاب میں انیس کے مختلف مرثیوں سے بارہ سو چوّن بندوں کو منتخب کرکے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پورا واقعۂ کربلا ربط و تسلسل کے ساتھ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی بندوں کی ترتیب سے ہم واقعے کے آغاز، درمیان اور اختتام سے واقف ہوجاتے ہیں اور ہمیں واقعے کے رونما ہونے کے اسباب کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ سرزمینِ کربلا پر یہ واقعہ کن کن جہات و جزئیات کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔ واقعے کے ربط کو قائم رکھتے ہوئے اس نوع کی منظوم ترتیب کا کام بہت مشکل تھا۔ اس خیال کو مسعود حسن رضوی نے کامیابی کے ساتھ ایک منظم اور مرتب صورت عطا کی لیکن اس صورت گری میں انھیں جو محنت اور کاوش کرنا پڑی اس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

''انیس کے مرثیوں سے مناسب اقتباسات منتخب کرکے انھیں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ایک مسلسل رزم نامہ وجود میں آجائے۔ یہ کام جتنا آسان اور سہل الحصول معلوم ہوتا تھا اتنا ہی دشوار اور صبر آزما نکلا۔ مناسب اقتباسات کی جستجو میں مراثیِ انیس کے ضخیم مجلدات کا بار بار مطالعہ کرنا پڑا اور ان متفرق

---

10 شاہکارِ انیس۔ مرتبہ مسعودِ حسن رضوی ادیب۔ نظامی پریس لکھنؤ 1943، ص 8

اقتباسات سے ایک مسلسل نظم مرتب کرنے کی کوشش میں بڑی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کرنا پڑی۔''(11)

اس منظوم مرقعے کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے مسعود حسن لکھتے ہیں :

''ان مختلف مضمونوں اور مختلف فضاؤں کے مرثیوں سے اقتباسات لے کر یہ رزم نامہ اس شرط کے ساتھ تیار کرنا تھا کہ اس کے اجزا میں کہیں تضاد، تناقض، یا عدمِ مطابقت کا احساس نہ ہو اور اس کی فضا میں کیفیات کی گوناگونی، جذبات کی بوقلمونی اور مناظر کی رنگا رنگی کے باوجود ایک عام یک رنگی اور ہمواری قائم رہے۔ یہ شرط پوری کرنے کی غرض سے کہیں کسی بیان کی جگہ بدلی گئی، کہیں ایک بیان کے اندر بندوں کی اور ایک بند کے اندر مصرعوں کی ترتیب بدل گئی۔ کبھی ایک بند کے چار مصرے کہیں سے اور بیت کہیں اور سے لی گئی اور کہیں ایک مصرعے کی جگہ کسی دوسرے مصرعے کو دی گئی۔ کسی بند کو اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھتے وقت ربطِ کلام اور مناسبتِ مقام کے تقاضے سے کبھی ایک۔ دو لفظ اور دو چار جگہ جہاں اور کوئی صورت ممکن نہ تھی کوئی پورا مصرعہ بدلنا پڑا۔ غرض ہر ممکن ذریعے سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ متفرق اجزا کا ایسا مجموعہ پیش کیا جائے جس میں جوڑ پیوند دکھائی نہ دیں۔''(12)

فہرستِ مضامین میں وقوع پذیری کے اعتبار سے اس منظوم رزم نامے کی تقسیم ان عنوانات کے ماتحت کی گئی ہے :

مناجات، امام حسین کی ولادت، بیعت کا سوال اور امام حسین کا انکار، امام حسین کا سفر، سفر کی آخری منزل، شبِ عاشورا، صُبحِ عاشورا، روزِ عاشورا، حر کا جہاد، انصار کا جہاد، عون ومحمد کا جہاد، قاسمِ نوشاہ کا جہاد، عباسِ علم دار کا جہاد، علی اکبر کا جہاد، امام حسین کا جہاد اور مجاہدینِ کربلا کا کارنامہ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کتاب پر اپنے جامع تبصرے میں مسعود حسن رضوی کے اس کام کی ان لفظوں میں تحسین کرتے ہیں :

---

11 رزم نامہ انیس۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ 1957، دیباچہ (ج)

12 ایضاً دیباچہ (د)

''یہ کام اس نوک پلک کے ساتھ انجام دینا کہ نہ انیس کی عظمت پر کہیں سے حرف آنے پائے اور نہ کلام میں کہیں سے جھول پیدا ہونے پائے، آسان نہ تھا۔ اس کی ہمت وہی کرسکتا تھا جو ایک طرف نفسیاتِ بشری کی این و آں کا رمز شناس ہو دوسری طرف شعروادب کی نزاکتوں پر نظر رکھتا ہو اور تیسری طرف کلامِ انیس کا حافظ ہو، اور حافظ کیا معنی یہ کہیے کہ کلامِ انیس اس کے رگ و ریشے میں بس چکا ہو۔ یہ مرتب صاحب ٹھہرے ان ساری شرطوں کے جامع۔ قدرتاً ان کے ہاتھوں یہ کام اس حد کو پہنچ گیا جو اس کے پہنچنے کا حق تھا۔''(13)

شاعرِ اعظم انیس

اڑتالیس صفحات کے اس مختصر کتابچے کی اشاعت 1966 میں یادگارِ انیس کمیٹی کے زیرِ اہتمام ہوئی۔ کتابچے میں انیس کے خاندانی حالات اور ان کے مرثیوں کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے نیز انیس کے بارے میں شبلی نعمانی، حالی، امداد امام اثر، سر تیج بہادر سپرو، نظر لکھنوی، پروفیسر اعجاز حسین، کلیم الدین احمد اور حامد حسین قادری کی تحریروں کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ آخر میں انیس کے سلاموں، رباعیوں اور چیدہ شعروں اور مرثیوں پر مشتمل انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ انیس پر مسعود حسن رضوی کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی انیس فہمی میں مدد دیتی ہے۔

اسلافِ میر انیس

یہ کتاب 1970 میں کتاب نگر، لکھنؤ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ کسی مقدمے اور دیباچے کے بغیر ایک سولہ اسّی صفحات پر مشتمل اس کتاب میں میر انیس کے اجداد کے تفصیلی حالاتِ زندگی، ان کی سیرت و شخصیت، مکالموں کے نمونے اور ان کی شاعری کے محاکے شامل ہیں۔ خاتمۂ کلام میں خلیق کے مرثیہ گو اخلاف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کی تصنیف میں مخطوطات، مطبوعہ تذکروں اور دیگر مطبوعات کو ملا کر 53 ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ اسلافِ میر انیس کا بیشتر حصہ تحقیقی نوعیت کا ہے لیکن کلام پر تبصروں کے ذریعے مسعود

13 ہفتہ وار صدق جدید۔ اگست 1958، ص 5۔ مشمولہ رزم نامۂ انیس

حسن رضوی نے میر انیس کے اجداد کے رثائی کلام کی شاعرانہ خوبیوں سے بھی متعارف کرایا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود حسن نے اس کے مواد کو جمع کرنے میں کتنی محنت کی ہے۔ یہ کتاب میر انیس کے اجداد کے سوانحی گوشوں اور شاعرانہ کاوشوں کا معتبر محاکمہ ہے۔

انیسیات

انیس سے متعلق اخباروں اور رسالوں میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین انیس کی شخصیت اور شاعری کے مختلف جہات کا احاطہ کرتے ہیں اور ان سے انیس کی زندگی، سیرت اور شاعری کی مختلف حیثیتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

208 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی نے اپنے اشاعتی منصوبے کی پہلی کڑی کے طور پر شائع کی۔ انیسیات سے قبل انیس سے متعلق مسعود حسن کی وہ کتابیں شائع ہو چکی تھیں جن کا تعارف سابقہ سطور میں کرایا جاچکا ہے۔ لیکن اپنے مشتملات کی بنا پر انیسیات جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ انیسیات میں شامل مضامین 1928 سے 1953 کے دوران شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کی ترتیب میں جن کی تعداد اکیس ہے، حیات اور شخصیت سے متعلق گیارہ مضامین پہلے رکھے گئے ہیں اور انیس کے فن سے متعلق دس مضامین بعد میں۔ ہر مضمون کے ابتدائی صفحے کے فٹ نوٹ میں مضمون کے ماخذ کا نام اور سنہِ اشاعت لکھ دیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مضمونوں کے عنوانات اس طرح ہیں :

میر انیس۔ مختصر تعارف، میر انیس کی علمی استعداد، میر انیس کی سیرت، میر انیس کی خوش آوازی۔ خوش بیانی اور مرثیہ خوانی، میر انیس کے کچھ چشم دید حالات، میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان، میر انیس کے دو استاد، میر انیس کا سفرِ حیدرآباد، میر انیس کے سفرِ حیدرآباد کا روزنامچہ، میر انیس کی بیماری، میر انیس کی وفات، اردو مرثیہ۔ ابتدا سے انیس تک ایک مختصر جائزہ، کلامِ انیس پر مختصر تبصرہ، میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال، ایک مباحثہ، میر انیس کی غزل گوئی، انیس و دبیر کا ایک تقابل، مرزا دبیر کی رباعی اور میر انیس کا شعر، میر انیس کے ایک مرثیے کا تجزیہ، میر انیس کی تخمیس مونس کے سلام پر

اور میر انیس کے نادر خطوط۔

ان مضامین کے عنوانات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ میر انیس کی شخصیت اور فن کے کن کن پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ زندگی اور شخصیت سے متعلق مضامین میں انیس کی سیرت، انیس کی خوش آوازی، میر انیس کے سفرِ حیدرآباد کا روزنامچہ بہت اہم ہیں۔ انیس کے فن سے متعلق مضامین میں انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال، ایک مباحثہ، 'انیس کی غزل گوئی' اور 'انیس کے مرثیے کا ایک تجزیہ' خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ مضمون 'انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال' میں مسعود حسن نے صنعتوں کے استعمال کے ہنر پر گفتگو کی ہے اور شروع ہی میں اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ''صنعتوں کا استعمال بذاتِ خود شاعری نہیں ہے لیکن شاعر اگر ان کے استعمال میں سلیقے اور امتیاز سے کام لے تو کلام کے حسن اور اثر میں اضافہ کر سکتا ہے۔''

آگے چل کر مسعود حسن نے صنعتوں کی مختلف قسموں اور مثالیں دے کر ان کے مختلف درجوں کی وضاحت کی ہے۔ اپنی اس انتہائی کارآمد گفتگو کے بعد انھوں نے لکھا:

> ''ان چند اصولی باتوں کو نظر میں رکھیے اور اردو کے شاعروں پر ایک نگاہ دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ صنعتوں کے استعمال میں میر انیس کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔''(14)

پھر لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ صنعتوں کے محض استعمال اور حسنِ استعمال میں امتیاز نہیں کر سکتے اور صرف صنعتوں کی کثرت کو صناع کے کمال کی دلیل سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں بھی میر انیس کا پایہ بہت بلند رہے گا۔''(15)

مضمون کے بقیہ حصے میں مسعود حسن نے ہر طرح کی صنعتوں کے بہترین استعمال کی مثال میں انیس کے اشعار پیش کیے ہیں۔ پھر مضمون کے آخری حصے میں بتایا ہے:

---

14 انیسیات۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب۔ 1976، ص 124

15 ایضاً ص 124

> ''صنعتوں کے استعمال کے ساتھ سلاست اور روانی کا قائم رکھنا اور جملہ محاسن کلام اور مقتضیاتِ مقام کا لحاظ رکھنا خود ہی بڑا مشکل کام ہے، لیکن میر انیس نے کمال یہ کیا ہے کہ اکثر موقعوں پر ایک ایک بیت اور ایک ایک مصرعے میں کئی کئی صنعتیں برتی ہیں اور اس سے بھی مشکل کام یہ کیا ہے کہ صنعت در صنعت استعمال کر کے کلام کے حسن کو اور بھی چمکا دیا ہے۔''(16)

اس مضمون سے متصل مضمون کا عنوان ہے 'ایک مباحثہ'۔ یہ مضمون کسی نقاد الہ آبادی کا ہے جو رسالہ زمانہ میں ادیب کے مضمون 'میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال' (مئی 1938) کی اشاعت کے کوئی ڈیڑھ سال بعد اسی رسالے میں مسعود حسن کے مضمون کے جواب میں شائع ہوا جس میں نقاد الہ آبادی نے مسعود حسن کے مضمون پر کئی اعتراضات کیے تھے۔ مسعود حسن نے 'ایک مباحثہ' کے عنوان سے ان تمام اعتراضوں کے مدلل جواب دیے۔ مسعود حسن کا یہ مضمون رسالہ 'زمانہ' میں جنوری 1930 میں شائع ہوا۔ 'انیسیات' کے صفحات پر مسعود حسن کا اصل مضمون پندرہ صفحوں میں آیا ہے اور نقاد الہ آبادی کے اعتراضوں کے جوابوں پر مشتمل مضمون نے چودہ صفحات لیے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ادیب نے جواب دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انھوں نے ایک ایک اعتراض کا ثبوتوں اور حوالوں کے ساتھ مدلل جواب دیا ہے جس سے ان کا یہ مضمون بھی پہلے والے مضمون کی طرح اہم ہو گیا ہے۔

اسی طرح 'میر انیسکے ایک مرثیے کا تنقیدی اور توضیحی تجزیہ' شاہکارِ انیس کا مقدمہ ہے جسے اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ شاہکارِ انیس کے ذکر میں اس مقدمے کی اہمیت پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

---

16 انیسیات۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب۔ 1976، ص 135

تذکرے

مسعود حسن کے قیمتی اور نایاب ذخیرے میں کئی اہم اور نادر تذکرے بھی موجود تھے۔ انھوں نے ان تذکروں کی تاریخی اور ادبی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری سمجھا کہ ان کو مرتب کردیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ ان تذکروں کو مرتب کیا اور اپنے مقدموں میں ان کی اہمیت و کیفیت سے متعارف کرایا۔ ان تذکروں کے نام ہیں: تذکرۂ نادر، گلشنِ سخن اور جواہرِ سخن (جلد دوم)۔

تذکرۂ نادر

یہ تذکرہ مرتب کے مقدمے کے ساتھ 1957 میں سرفراز قومی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ تذکرے کے مصنف مرزا کلب حسین خاں نادر ناسخ کے شاگرد تھے۔ نادر نے پانچ سو اکیس شاعروں کی غزلوں کو مخمس کیا اور اس مجموعے کو 'دیوانِ غریب' کے نام سے مرتب کیا جو اس مجموعے کا تاریخی نام ہے۔ اور اس نام سے اس کی تالیف کا سال 1283ھ نکلتا ہے۔ نادر نے اس تذکرے میں جن شاعروں کی غزلوں کو مخمس کیا ہے ان کے ضروری حالات مخمسوں کی پیشانی پر مختصراً لکھ دیے ہیں۔ مسعود حسن رضوی نے مقدمے میں تذکرے کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

> ''یہ کتاب کمزور کاغذ پر چھاپی گئی تھی جو اب اپنی عمر پوری کر چکا ہے۔ حالت یہ ہوگئی ہے کہ ذرا بے احتیاطی سے ورق الٹا اور اس کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں رہ گیا۔ کتاب کی یہ نازک حالت دیکھ کر اپنے اتنے بہت سے شاعروں کو گمنامی سے بچانے کی خواہش بے اختیار میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کو ایک تذکرے کی صورت میں مرتب کرکے تذکرۂ نادر نام رکھ دیا۔''[1]

---

1 مقدمۂ تذکرۂ نادر، ص 15

مقدمے میں مسعود حسن رضوی نے نادر کے سوانحی حالات مختصراً بیان کیے ہیں اور ضروری تفصیلات کے ساتھ نادر کے جن منظومات و تصنیفات کا ذکر کیا ہے ان کے نام ہیں: شوکتِ نادری، صولتِ نادری، خاتمۃ المناقب عرف چہل بندِ نادری، شرحِ خاتمۃ المناقب، فضائل الشہدا، تلخیصِ معلّٰی، سرب لابھ، دیوانِ غریب، نظمِ نادر، توصیفِ زراعت، خلاصۂ قانونِ مال و کلکٹری۔

آخر میں تذکرے میں شامل شاعروں کی فہرست بھی موجود ہے۔

تذکرۂ گلشنِ سخن

میر کاظم مخاطب بہ مردان علی مبتلا کے فارسی زبان میں لکھے ہوئے اس تذکرے کا ایک نسخہ مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں تھا اور دوسرا رضا لائبریری رام پور میں۔ مسعود حسن نے 'شعرائے اردو کا ایک قدیم تذکرہ' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر اپنے پاس موجود اس نسخے کا تعارف کرایا۔ یہ مضمون دسمبر 1923 میں رسالہ ہمایوں میں چھپا۔ مولوی عبدالحق نے مسعود حسن رضوی سے اس نسخے کو مرتب کرنے کی فرمائش کی اور مقابلے کے لیے نسخۂ رام پور کی ایک نقل انھیں بھجوا دی۔ مسعود حسن رضوی نے دونوں نسخوں کا مقابلہ کر کے اس تذکرے کو مرتب کیا جو ان کے طویل مقدمے کے ساتھ 1965 میں انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کے زیرِاہتمام شائع ہوا۔ مسعود حسن رضوی نے اس تذکرے میں دونوں نسخوں کے اختلاف کو بھی ظاہر کردیا ہے۔ اپنے ہر مقدمے کی طرح یہاں بھی انھوں نے سوانحی گوشے کو نظرانداز نہیں کیا ہے، اسی کے ساتھ مبتلا کے کلام کا جائزہ بھی لیا ہے۔ لیکن تذکرے میں حواشی موجود نہیں ہیں۔

تذکرۂ گلشنِ سخن میں 318 شاعروں کا ذکر ہے جس میں ہر صنف کے شعرا شامل ہیں۔ تذکرے میں شعرا کے احوال کم اور کلام کا انتخاب زیادہ ہے۔ شعرا کے احوال میں بعض کی نثرنگاری کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

مشفق خواجہ نے اس تذکرے کی اشاعت کے زمانے سے اختلاف کیا اور اسے ایک

اور تذکرے 'گلزارِ ابراہیم' کا چربہ قرار دیا۔

مرتب کی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود مشفق خواجہ نے اس کی ترتیب و اشاعت پر ان تحسینی کلمات کا اظہار کیا ہے:

''جناب ادیب نے متن کی تیاری میں جو محنت کی ہے اس کی داد کچھ وہی دے سکتے ہیں جنھیں اس قسم کے کاموں کا تجربہ ہے۔''(2)

جواہرِ سخن (جلد دوم)

کائستھ پاٹھ شالہ پریس، الہ آباد سے 1935 میں شائع ہوا۔

ہندوستانی اکاڈمی کی مجلسِ انتظامیہ کی تجویز پر مولوی محمد مبین چریا کوٹی نے اردو کے سربرآوردہ سخن وروں کا انتخاب 'جواہرِ سخن' کے نام سے چھ جلدوں میں منتخب کیا۔ اکاڈمی کی مجلسِ انتظامیہ نے انتخاب کی ہر جلد پر نظرِ ثانی کی غرض سے چھ نامور ادیبوں کا انتخاب کیا جن میں مسعود حسن رضوی بھی شامل تھے۔ انھوں نے اہم ترین شعرا کے انتخاب پر مشتمل چھ جلدوں میں سب سے زیادہ ضخیم دوسری جلد پر نظرِ ثانی کی۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

''نظرِ ثانی کرتے وقت میں نے زیادہ تر حذف و ترمیم سے کام لیا... بعض شعرا کے خصوصیاتِ کلام ازسرِ نو لکھے۔ کلام کے انتخاب میں بھی زیادہ تر حذف سے کام لیا... اس کانٹ چھانٹ کے بعد کتاب کی ضخامت نصف کے قریب رہ گئی۔ پھر بھی یہ جلد تقریباً ہزار صفحوں پر مشتمل ہے۔''(3)

دیباچے میں مسعود حسن رضوی نے اس عہد کی شاعری کے خصوصیات بھی لکھے ہیں اور اس عہد کے شعرا کے کلام کے امتیازات بیان کرتے ہوئے میر سے اپنی دلی عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے:

''حضرتِ میر سے مجھ کو دلی عقیدت اور ان کے کلام کی میری نظر میں جو وقعت ہے اس نے مجھے مجبور کردیا کہ اس شاعرِ اعظم کے جو بلند پایہ اشعار نظر انداز ہوگئے ہیں انھیں انتخاب میں شامل کروں... مگر میری کم فرصتی نے اس

2 سہ ماہی اردو، کراچی۔ جولائی 1967 ص 134-133

3 جواہرِ سخن۔ کائستھ پاٹھ شالہ پریس الہ آباد، 1935 جلد دوم ص 3-1 (دیباچہ)

کا موقع نہ دیا... میں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کرنے میں بہت سا وقت صرف کیا اور بہت کچھ حذف و اضافہ کیا۔ پھر بھی یہ انتخاب ایسا نہ ہوا جیسا میرا جی چاہتا تھا۔"[4]

4 جواہرِ سخن۔ کائستھ پاٹھ شالہ پریس الہ آباد، 1935 جلد دوم ص 3-1 (دیباچہ)

متفرقات

متفرقات کے ذیل میں مسعود حسن رضوی کی ان کتابوں کو رکھا گیا ہے جن کا تعلق متفرق موضوعات سے ہے یعنی جنھیں کسی ایک سلسلۂ موضوع کے ماتحت نہیں لایا جاسکتا۔ یہ کتابیں مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ یہ موضوعات بہت اہم اور دل چسپ ہیں اور یہ کتابیں تحقیقی اعتبار سے بہت کارآمد اور معلومات افزا ہیں۔ ان کتابوں کے نام ہیں:
'مجالسِ رنگین'، 'فسانۂ عبرت'، 'فائز دہلوی اور دیوانِ فائز' ،'دبستانِ اردو' اور 'نگارشاتِ ادیب'۔

مجالسِ رنگین

یہ کتاب اصلاً سعادت یار خاں رنگین دہلوی کی تصنیف ہے جس میں رنگین نے مختلف شہروں میں مختلف شاعروں سے اپنی ملاقاتوں اور صحبتوں کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کی تصنیف کا سبب یہ ہے کہ رنگین لکھنؤ میں چند دوستوں اور عزیزوں کے درمیان ان صحبتوں کا ذکر کر رہے تھے کہ اس بزم میں موجود ان کے دوست مرزا نعیم بیگ جوان نے خیال ظاہر کیا کہ کیوں نہ اس گفتگو کو ایک رسالے کی شکل میں لکھ دیا جائے۔ انشاء اللہ خاں انشاء نے اس کی تائید کی۔ چنانچہ یہ رسالہ وجود میں آیا۔ کتاب کا نام بھی سید انشاء کا تجویز کیا ہوا ہے۔ اور بقول ادیب ''مصنف کے نام اور کتاب کے موضوع کے اعتبار سے اس سے بہتر نام ملنا مشکل تھا۔''

کتاب میں چودہ صفحات کا مقدمہ ہے۔ دو صفحوں میں رنگین کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ سترہ سے بہتر صفحے تک رنگین کی باسٹھ مجلسوں کا بیان ہے اور آخر کے چار صفحوں میں

اشخاص و مقامات کی فہرست ہے۔

'مجالسِ رنگین' کا ایک نسخہ ادیب کے کتب خانے میں موجود تھا۔ انھوں نے اس نسخے کو اسی طرح شائع کر دیا۔ اپنے پاس موجود نسخے کو دوسرے نسخوں سے مقابلہ کیے بغیر شائع کرنے کا سبب ادیب نے مقدمے میں اس طرح بیان کیا ہے:

''مجالسِ رنگین کا جو نسخہ میرے کتاب خانے میں ہے وہ 1264ھ میں مطبعِ محمدی میں چھپا تھا۔ ایک نسخہ محترمی پنڈت منوہر لال زتشی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ مگر وہ اسی مطبع اور اسی سنہ کا چھپا ہوا ہے۔ لندن میں انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے جس کی تاریخِ تحریر 5 جمادی الاول 1249ھ ہے۔ ایک قلمی نسخہ اور بھی ہے۔ مگر ان تک میری رسائی نہیں۔ بہرحال اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن یا کوئی قلمی نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا، اس لیے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکا۔''(1)

کتاب کے مقدمے میں مرتب نے اصل کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

'مجالسِ رنگین' نہایت دل چسپ اور پراز معلومات کتاب ہے۔ اس میں بہت سے ان شاعروں کا حال مل جاتا ہے جن کے بیان سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ اور چونکہ رنگین کے تمام بیانات چشم دید ہیں لہٰذا مستند بھی ہیں۔ جتنے آدمیوں کا ذکر آیا ہے ان کی فہرست محلوں کے حوالوں کے ساتھ کتاب کے آخر میں درج ہے۔ اس کتاب سے رنگین کے زمانے کے مذاقِ شعر، اس دور کے لوگوں کی طبیعت اور اس عہد کی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔''(2)

مقدمے میں ادیب نے اصل کتاب میں رنگین کے بارے میں بیان کی ہوئی بہت سی باتوں کو بہ ترتیب یکجا کر دیا ہے جس سے ان کا ایک مختصر سوانحی خاکہ بن گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ادیب نے رنگین کی نثر نگاری، شاعری اور ریختہ گوئی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مسعود حسن رضوی نے اسے نثر میں رنگین کی پہلی اور آخری کتاب قرار دیا ہے لیکن

1 مجالسِ رنگین، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب نظامی پریس لکھنؤ، 1929 ص 13 (مقدمہ)

2 ایضاً ص 1

بعد کے محققین نے رنگین کی دوسری نثری کتابوں کی دریافت کا بھی دعویٰ کیا ہے۔

74 صفحوں کی یہ کتاب نومبر 1929ء میں نظامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

فسانۂ عبرت

رجب علی بیگ سرور کی لکھی ہوئی اس کتاب کو مرتب کرکے ادیب نے چھ صفحات کے دیباچے کے ساتھ 1957 میں تنظیم پریس لکھنؤ سے شائع کرایا۔ دیباچے میں مسعود حسن نے سرور کی نثرنگاری ان کی تصنیفات و تالیفات اور ان کے تراجم کی مختصر تفصیل بیان کی ہے۔ 128 صفحات کی اس کتاب میں ادیب اصل کتاب کی نوعیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''معلوماتی نقطۂ نظر سے سرور کی سب سے زیادہ قابلِ قدر کتاب 'فسانۂ عبرت' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اودھ کے آخری چار بادشاہوں یعنی نصیرالدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ اور ان کے عہد کے وہ حالات بیان کیے ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھے یا اپنے کانوں سے سنے تھے... اس کتاب کا سب سے زیادہ نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس میں اس عہد کی شاہی تفریحوں، تقریبوں اور ثقافتی مظاہروں اور نمائشوں کو خاص طور پر جگہ دی گئی ہے... یہاں آپ کو میلوں اور بازاروں کی بھیڑ بھاڑ، شادی بیاہ کی دھوم دھام، براتوں کے شاہی جلوس، ناچ گانے کی محفلیں، رئیسوں کے جلسے سبھی کچھ تو دکھائی دے گا۔''[3]

یہ کتاب مسعود حسن رضوی کے ذخیرے میں بہت خستہ حالت میں تھی۔ اس کی بوسیدگی اور خستگی کی بنا پر انھوں نے اودھ کے تاریخی اور ثقافتی حالات کے ایک اہم ماخذ کے تلف ہوجانے کے خوف سے اس کی ترتیب واشاعت کو ضروری سمجھا۔ ترتیب میں اپنے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پہلے کے چھپے ہوئے نسخے میں سرخیاں بہت کم تھیں، عبارت پاروں میں منقسم نہ تھی، اوقاف کے نشانات معدوم تھے۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کون بیان کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہوتا ہے اور اکثر مقاموں پر کلام کا ربط اور

---

3 فسانۂ عبرت۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ تنظیم پریس لکھنؤ۔ 1957 ص 7-6

عبارت کا مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ یہ سب نقائص دور کر دیے گئے ہیں۔ بہت سے لفظ مشکوک تھے جن میں سے بعض کی قیاسی تصحیح کردی گئی ہے اور بعض مجبوراً بجنسہ نقل کر دیے گئے ہیں۔ بعض واقعات کی تاریخیں غلط تھیں اور بعض جگہ ہجری اور عیسوی تاریخوں میں مطابقت نہ تھی۔ جہاں تک ممکن ہوا، ان کی تصحیح و تطبیق کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں ایک بیان کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں کوئی دوسرا بیان داخل تھا اور اب وہ ٹکڑے یکجا کردیے گئے ہیں اور ایسا کرنے سے ایک آدھ فقرہ جو بے ضرورت ہوگیا تھا، حذف کردیا گیا ہے۔''(4)

عبدالماجد دریابادی نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ادیب کی محنت کی داد دیتے ہوئے لکھا:

''سید مسعود حسن رضوی نے محنت کرکے اسے پھر سے چھاپا۔ محنت اس معنی میں کہ اس کی نئی ترتیب و تہذیب اور حذف و ترمیم میں انھیں وقت خاصا صرف کرنا پڑا... چھ صفحے کا دیباچہ بجائے خود دلآویز ہے۔''(5)

دبستانِ اردو

ابتدائی درجوں (تیسرے۔ چوتھے) میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے لیے لکھی گئی تھی جن میں مسعود حسن رضوی کے ساتھ دوسرے ادیبوں کے تیار کیے ہوئے سبق بھی شامل ہیں لیکن سب سے زیادہ سبق ادیب کے لکھے ہوئے ہیں۔

مسعود حسن رضوی نے چونکہ ایل ٹی کی سند بھی حاصل کی تھی اس لیے تعلیم کے اصولوں اور بچوں کے نمو پاتے ہوئے ذہن اور ان کی نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے انھوں نے اس کی تالیف کی ہے اور دیباچے میں لکھا ہے: ''کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتاب زبان کی پاکیزگی اور خوبصورتی میں، سبقوں کی نوعیت اور ترتیب میں اور ادب و اخلاق کی تعلیم میں موجودہ درسی کتابوں سے بہتر ہو۔''

کتاب میں ادیب کے سترہ مضامین شامل ہیں جن کے عنوان ہیں: دیاسلائی،

---

4 فسانۂ عبرت۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ تنظیم پریس لکھنؤ۔ 1957، ص 8-7

5 ہفتہ وار صدقِ جدید، لکھنؤ یکم اگست 1958

جوالا مکھی پہاڑ، اونٹ، ہوا، گرمی کا دن، درخت، چھاپے کی کل، پانی کا سفر، ریل کا سفر، اکبر بادشاہ (دو سبق)، نور جہاں بیگم (دو سبق)، تاج محل (دو سبق)، سکندرِ اعظم (دو سبق)۔

مضامین کی نوعیت ادبی اور معلوماتی ہے۔ زبان سہل اور سادہ ہے اور عطف واضافت کے بغیر ہے۔ زبان کی صفائی اور سادگی سبق 'سکندرِ اعظم' کی اس مختصر عبارت میں ملاحظہ ہو:

> ''کہتے ہیں کہ سکندر نے کسی نجومی سے اپنی موت کا وقت دریافت کیا تھا۔ نجومی نے کہا تھا کہ آپ اس وقت انتقال کریں گے جب زمین لوہے کی اور آسمان سونے کا ہوجائے گا۔ سکندر کو اس کی بات سن کر بہت تعجب ہوا تھا۔ مگر جب بابل میں پہنچ کر سکندر کو بخار آیا اور اس نے گھوڑے سے اتر کر زمین پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو ایک وفادار سپاہی نے اپنی لوہے کی زرہ زمین پر بچھا دی۔ سکندر اس پر بیٹھ گیا۔ دھوپ تیز تھی۔ ایک سردار نے اپنی سونے کی ڈھال سے اس پر سایہ کرلیا۔ سکندر نے نیچے اوپر نگاہ کی۔ اسے نجومی کی پیشین گوئی یاد آئی اور اپنی موت کا یقین ہوگیا۔ نجومی کی بات سچ نکلی۔ سکندر چند روز بیمار رہ کر اس دنیا سے چل بسا۔ سارا مال و اسباب یہیں رہ گیا۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے:
>
> مہیا گرچہ کل اسبابِ ملکی اور مالی تھے
> سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے'' [6]

یہ کتاب پہلی بار 1935 میں اور دوسری بار 1939 میں نیشنل پریس الہ آباد سے شائع ہوئی۔

نگارشاتِ ادیب

374 صفحات کو محیط مختلف ادبی موضوعات پر اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بیشتر تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ ان میں پہلا مضمون 'نواز اور شکنتلا ناٹک' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کے سرنامے میں ادیب نے لکھا ہے کہ ''نواز (؟) اور اس کی شکنتلا ناٹک (؟) کے بارے میں لکھنے والوں نے جتنی غلط بیانیاں کی ہیں، اتنی شاید کسی مصنف اور کسی کتاب کے بارے میں نہیں کی گئیں۔''

---

6 دبستانِ اردو مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، نیشنل پریس الہ آباد 1939، ص 140

پھر انھوں نے کتاب کے بارے میں پندرہ ادیبوں کے بیانوں کو نقل کیا اور ان بیانوں کی روشنی میں چھ سوال قائم کیے، ان چھ سوالوں سے چھبیس جواب نکالے اور اصل کتاب کے متن کے مطالعے کے بعد استدلال کے ساتھ نکالے ہوئے جوابوں اور جواب دینے والوں کی غلط بیانیوں کو غلط ٹھہرا کر یہ ثابت کیا کہ شکنتلا ناٹک نہیں ہندی کی مختلف بحروں میں ایک منظوم قصہ ہے اور اس کا مصنف ایک مسلمان شاعر نواج ہے جس نے نواب اعظم خاں کی فرمائش پر فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا ناٹک کا قصہ بھاکھا میں نظم کردیا ہے۔

'نگارشات' کے اٹھارہ مضامین میں تین مضمون غالبیات سے متعلق ہیں: (1) 'غالب کے دو تعزیت نامے اور چتا جان'، (2) 'مرزا غالب کی ہنگامہ خیز مثنوی'، (3) 'مرزا غالب: تب اور اب' ایک مضمون میر کے لطیفوں سے متعلق ہے۔ پانچ مضامین ایسے ہیں جن میں بعض غیر معروف لیکن اہم شاعروں کا تعارف ہے۔ یہ شاعر ہیں: 'رائے ٹیکارام تسلّی شاگردِ مکین و مصحفی'؛ 'شہید شاگردِ ناسخ'؛ 'یاور شاگردِ شہید'، 'عرش فرزندِ میر' اور 'کلیم دہلوی' وغیرہ۔ بعض مضامین ایسے ہیں جن سے مشہور شعرا کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسے 'آتش کا مذہب'، 'دیوانِ افسوس کا ایک قدیم نسخہ' امیر مینائی کی دو نایاب کتابیں وغیرہ۔ ایک مضمون میر عشق کی اصلاحِ زبان پر ہے اور ایک مضمون میر انیس کے پوتے دولہا صاحب عروج کے بارے میں ہے۔ بقیہ مضمونوں میں ایک مختصر مضمون 'فارسی اور اردو کا ایک فرانسیسی ادیب اور شاعر' کے عنوان سے ہے جس میں اس کتاب کے بارے میں بتایا گیا ہے جو بادشاہ نصیرالدین حیدر کے ایک فرانسیسی مصاحب پتر یک فورتیر نے عتابِ شاہی نازل ہونے کے بعد بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس یقین کے ساتھ لکھی تھی کہ اس کی یہ علمی خدمت عفوِ قصور کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس کتاب میں فرانس کے مشہور عالم، شاعر اور مصنف والتیر کی کتاب 'زادیک' کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ایک اور مضمون میں عطاء اللہ بن محمود الحسینی کے تالیف کیے ہوئے رسالۂ قافیہ کا تعارف کرایا گیا ہے اور آخری مضمون جو سب سے زیادہ طویل ہے، شہر آشوب کی صنف

سے متعلق ہے جس میں شہرآشوب کا ابتدائی مفہوم اور وجہِ تسمیہ بتا کر مختلف شاعروں کے مختلف صورتوں اور طرزوں کے شہرآشوبوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

فائز دہلوی اور دیوانِ فائز

دیوانِ فائز کی پہلی اشاعت کے پیش نامے میں مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

''کوئی بیس برس ہوئے کہ فائز کا ضخیم کلیات مجھ کو پرانی کتابوں کے ایک تاجر سے مستعار ملا۔''(7)

یہ پیش نامہ 30 جون 1945 کو لکھا گیا ہے۔ یعنی مسعود حسن رضوی کو یہ کلیات 26-1925 میں ملا ہوگا۔ بیس برس تک ادیب فائز کے حالات و تصنیفات کی جستجو، ان کی تصنیفوں اور تخلیقوں کے غائر مطالعے، ان کے دیوان کے متن کی صحیح قرأت کرنے، تشریح طلب مقامات پر حاشیے لکھنے اور مشکل الفاظ کی فرہنگ تیار کرنے میں مصروف رہے۔ پھر 1945 میں ایک کتاب مرتب ہوئی جس کے اندرونی سرورق پر چار سطروں میں لکھا گیا:

شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر نواب صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی اور اس کا دیوان۔

انجمنِ ترقیِ اردو (ہند) نے اس کتاب کے بیرونی سرورق پر صرف 'دیوانِ فائز' لکھ کر اسے 1946 میں شائع کیا۔ یوں اس کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کی اشاعتِ ثانی میں آکسفورڈ میں موجود کلیاتِ فائز کے نسخے اور اور کلیاتِ فائز پر قاضی عبدالودود کے ایک مفصل تبصرے سے مدد لی گئی۔ مطالب کے اضافے اور جدید ترتیب کے ساتھ اس کی دوسری اشاعت نظامی پریس، لکھنؤ سے 1965 میں ہوئی اور اب کے سرورق کی عبارت تھی:

''شمالی ہند میں اردو کا سب سے قدیم صاحبِ دیوان شاعر:

فائز دہلوی اور دیوانِ فائز''

یہاں اسی اشاعتِ ثانی کا تعارف مقصود ہے۔

یہ دوسری اشاعت 269 صفحات پر مشتمل ہے جس میں اشاعتِ دوم کے پیش نامے

---

7 فائز دہلوی اور دیوانِ فائز طبعِ دوم 1965، ص 9 (پیش نامہ)

کے ساتھ اشاعتِ اول کا پیش نامہ بھی شامل ہے۔ مرتب نے 133 صفحے کے اپنے طویل مقدمے میں بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ فائز کے سلسلۂ خاندان کی مختلف کڑیاں جوڑ کر ان کے احوال و آثار تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ پھر فائز کی مختلف تصنیفوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ اسی تفصیل میں فائز کے خطبۂ کلیات کا ذکر کرتے ہوئے شاعری سے متعلق فائز کے چند نکتے بیان کیے ہیں۔ پھر فائز کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا ہے جس میں ان کی شاعری کے محرکات، ان کی قصیدہ گوئی، صداقت پسندی، ان کے کلام میں بے ساختگی اور فائز کے دیگر شعری محاسن شامل ہیں۔ اس کے بعد 'فائز کا اردو کلام' کے عنوان سے فائز کی اردو شاعری کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ جس میں فائز کے کلام میں مقامی رنگ، صنعتیں، تشبیہیں، استعارے، فائز کی نظموں، ہم طرح غزلوں، ان کی زبان، کلام میں عیوبِ قافیہ اور فائز کے رسمِ خط کا جائزہ شامل ہے۔ پھر بیالیس صفحات میں خطبۂ کلیاتِ فائز کا اصل متن ہے اور 54 صفحوں میں حواشی کے ساتھ فائز کے اردو کلام کا متن ہے جس میں غزلیات، مخمس اور مثنویاتِ ریختہ شامل ہیں۔ آخر کے 19 صفحوں میں کلام کی فرہنگ دی گئی ہے۔

مسعود حسن رضوی نے دیوانِ فائز کی تلاش وترتیب میں جو محنت اور جانفشانی کی ہے اس کی داد قاضی عبدالودود نے بھی دی ہے۔ مسعود حسن نے فائز کو شمالی ہند میں اردو کا سب سے قدیم صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا ہے۔ اور اگر فائز کو پہلا شاعر نہ بھی تسلیم کیا جائے، تب بھی مسعود حسن کا یہ کام اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں فائز سے متعلق تمام معلومات موجود ہیں اور ادیب نے فائز کی شاعری کا جو ادبی اور لسانی جائزہ پیش کیا ہے اس سے نہ صرف فائز کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس عہد کی شعری زبان کی صورت و ساخت بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور دیوانِ فائز کی فرہنگ سے اس عہد کے دوسرے شعرا کے بھی کلام کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

اس کتاب کو تیار کرنے میں مسعود حسن رضوی نے 48 ماخذوں سے کام لیا ہے۔

○

لسانیات و قواعد

مسعود حسن رضوی کی تصنیفوں اور تالیفوں میں تین کتابیں ایسی ہیں جو لسانیات سے ان کی واقفیت کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف ادبی جریدوں اور رسالوں میں شائع ہونے والے ان کے بہت سے ایسے مضامین بھی ہیں جن میں زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا، لغات کے علم اور ان کی تحقیق، بدیع و بیان، امثال، مترادفات، تراکیب، اصلاحِ زبان اور رسمِ خط کے بارے میں بڑی جامع اور مدلّل گفتگو کی گئی ہے۔ اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اور قواعد کے مسائل پر ادیب کی گہری نظر تھی۔ اگر انھیں اپنی دوسری مصروفیتوں سے وقت نکالنے کا موقع ملتا تو یقیناً وہ اس طرف مزید توجہ دیتے اور لسانیات و قواعد سے متعلق ان کی وہ تصنیفیں بھی سامنے آتیں جو اردو کے لسانی اور قواعدی نظام کی مزید جہتوں کو نمایاں کرتیں۔ تاہم ان موضوعات سے متعلق ان کی جتنی تحریریں موجود ہیں وہ اردو کے بیشتر لسانی مسائل کی وضاحت میں معاون ہوتی ہیں۔ کتابوں کی شکل میں اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے:

اردو زبان اور اس کا رسمِ خط

یہ دراصل وہ صدارتی خطبہ ہے جو مسعود حسن رضوی نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے تیرہویں اجلاس میں اکتوبر 1946 میں 'اردو زبان اور رسمِ خط کا مسئلہ' کے عنوان سے دیا تھا۔ بعد میں یہی خطبہ 'اردو زبان اور اس کا رسمِ خط' کے عنوان سے جولائی 1948 میں کتابی شکل میں شائع ہوا اور اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ستمبر 1961 میں شائع ہوا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ 'اردو زبان' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں زبان کا آغاز و ارتقاء اس کے ترکیبی عناصر، اس کی قومی اور تمدنی اہمیت، زبان کے مدارج و

مخارج پر اختصار لیکن وضاحت اور استدلال کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے اور مخلوط تہذیب کے ضمن میں اردو اور ہندی کے رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس طرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی حاصل کر سکیں گے اور ایک دوسرے کی تہذیب کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔ اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں مختلف انجمنوں اور اداروں کے خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے درج ذیل باتوں کو فوری توجہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے:

(1) ان اہم ادیبوں کی مستند سوانح عمریاں لکھی جائیں اور ان کی تصنیفوں کے صحیح اور معتبر اڈیشن نکالے جائیں جو ابھی تک گمنامی کے عالم میں ہیں۔

(2) نظم و نثر کی ابتدائی اور قدیم کتابوں کے صحیح اڈیشن تحقیقی مقدموں اور توضیحی حاشیوں کے ساتھ تیار کیے جائیں۔

(3) اردو ادب کے ساتھ اردو زبان کی مستند تاریخ کا لکھا جانا بھی ضروری ہے۔

(4) اردو کی مکمل اور جامع قواعد لکھی جائے۔

(5) لسانیات اور صوتیات پر بھی کتابیں لکھی جائیں اور ان موضوعوں پر مغربی زبانوں کی بلند پایہ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔

(6) اردو میں ایک جامع اور صحیح اصول پر مرتب کی ہوئی لغت تیار کی جائے۔

(7) اردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جائے۔

آخر میں مصنف نے نئے اور نوجوان ادیبوں کو بعض قیمتی مشورے دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے لیے علومِ ادبیہ کی تحصیل بہت ضروری ہے۔ مسعود حسن کے خیال میں فنونِ لطیفہ میں کوئی شخص محض طبعی مناسبت کی بنا پر ماہرِ فن نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کا ذوق کتنا ہی صحیح ہو مگر اصولی واقفیت اور عملی مہارت کے بغیر اس کا شمار اتائیوں ہی میں رہے گا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں اردو رسمِ خط کا تکنیکی بنیادوں پر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ رسمِ خط کا تبدیل کیا جانا ایک مضحکہ خیز مطالبہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسمِ خط کی تبدیلی سے اردو کو کیا خطرہ لاحق ہے اور اس کے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں۔ مسعود حسن نے فارسی حروف کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ذخیرے

میں موجود فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی کئی ہندی کتابوں کا حوالہ دینے کے بعد اردو اور ناگری رسمِ خط کے فرق کی وضاحت کی ہے اور رسمِ خط کی خصوصیتیں بیان کی ہیں جو ذیل مین درج ہیں:

(1) اردو حروف ناگری حرفوں سے بہت زیادہ آوازیں ادا کر سکتے ہیں۔

(2) اردو کے مفرد حروف بہت سادہ اور مختصر ہیں اور جب وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔

(3) ناگری کے مفرد حرفوں کی شکلیں اردو حرفوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں اس لیے ان کو سیکھنے میں بھی زیادہ دیر لگتی ہے اور لکھنے میں بھی۔

(4) ناگری میں دس مختلف آوازوں کی خفیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور بھاری دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ حروف مقرر کیے گئے ہیں۔ علاحدہ علاحدہ علامتیں مقرر کرنے سے ناگری حرفوں کی تعداد بلا ضرورت بڑھ گئی ہے۔

(5) ناگری میں زیر کے لیے کوئی ماترا نہیں ہے۔ اسے ظاہر کرنے کے لیے حرفوں کو ملا کر لکھنا پڑتا ہے جس سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل صورتیں بن جاتی ہیں۔

(6) ناگری میں تشدید کے لیے کوئی علامت نہیں ہے۔

(7) ناگری میں حرف ر کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد علامتیں ہیں۔

(8) ناگری میں بعض آوازوں کے لیے دو۔دو حرف ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں۔

(9) ناگری میں کھ کی آواز کے لیے جو حرف ہے وہ 'ر' اور 'و' کی علامتوں کا مجموعہ ہے اس سے بڑی خرابیاں پڑ سکتی ہیں۔

مسعود حسن رضوی نے دونوں رسم الخطوں کے فرقوں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اردو رسمِ خط میں خامیاں نکالنے والوں کو مدلّل جواب دیے ہیں۔ انھوں نے اردو میں ایک ہی آواز کے حروف کو حروفِ تہجی سے خارج کیے جانے کی مدافعت کرتے ہوئے مثالیں دے کر یہ بتایا ہے کہ وہ لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنوں میں مختلف ہیں، جب لکھ دیے

جاتے ہیں تو املے کے اختلاف سے اپنے معنی خود بتادیتے ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے رومن رسم خط کی تائید کرنے والوں سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''کسی زبان کا رسمِ خط معیّن کرتے وقت اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی آسانی یا فائدے کا خیال اصل اصول ہونا چاہئے۔'' انھوں نے رومن رسمِ خط کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کیا ہے۔

رسمِ خط کے بدلنے کے نقصانات پر گفتگو کرتے ہوئے مسعود حسن نے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

(1) رسم خط بدلنے سے زبان کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

(2) رسمِ خط کی تبدیلی اس رشتے کو منقطع کردے گی جو ہماری زبان کے حال کو اس کے ماضی سے جوڑتا ہے۔

(3) اگر اردو کا تعلق فارسی عربی سے باقی رکھنا ہے تو اس کے موجودہ رسمِ خط کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔

(4) اردو میں ادبی تحقیق کے واسطے فارسی کا علم ضروری ہے اور ان دونوں زبانوں کے لسانی اور ادبی تعلقات کی وجہ سے اردو جاننے والوں کے لیے فارسی کا سیکھ لینا آسان ہے۔

(5) رسمِ خط کی تبدیلی سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہزارہا کتابیں جو اب تک لکھی جا چکی ہیں بے کار اور رفتہ رفتہ مفقود ہوجائیں گی۔

(6) انشا پردازوں نے لفظی صنعتوں کے استعمال میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آسکے گا۔

(7) حرفوں کی تبدیلی سے حسابِ جمل کا وجود نہ رہے گا۔

ان پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے بعد مسعود حسن لکھتے ہیں:

> ''مختلف پہلوؤں سے نظر کرنے کے بعد یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ اردو کا موجودہ رسم خط برقرار رکھا جائے۔''[1]

مسعود حسن رضوی رسمِ خط میں اصلاح کے مخالف ہیں۔ ان کے خیال میں:

---

1 اردو زبان اور اس کا رسمِ خط۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ طبع دوم، کتاب نگر لکھنؤ 1961، ص 83

''اس میں اصلاحیں کی جاسکتی ہیں مگر صرف ایسی جو اس کی صورت کو مسخ نہ کردیں۔''(2)

پہلے حصے کی طرح یہاں بھی مسعود حسن نے کچھ اہم تجویزیں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عجلت کے اس زمانے میں لیتھو کی چھپائی ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح اردو کی کتابیں بھی ٹائپ میں چھاپی جائیں... اور ''چھپائی میں آسانی کے خیال سے حرفوں کی صورت میں کسی قدر تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے مگر یہ تبدیلی ایسی ہونا چاہیے کہ چھپے ہوئے اور لکھے ہوئے لفظ صورت میں ملتے جلتے ہوں تاکہ جو کوئی چھپا ہوا لفظ پڑھ سکتا ہو وہ لکھا ہوا لفظ بھی آسانی سے پڑھ لے۔''(3)

کتاب کے دونوں حصوں میں زبان اور رسمِ خط سے متعلق مسعود حسن رضوی نے جو بحثیں کی ہیں ان کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے رسالہ 'ماہ نو' کراچی نے مارچ 1949 کی اشاعت میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''اردو زبان اور رسمِ خط کے مسئلے پر انگریزی اور اردو میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں اور ان سے کہیں زیادہ مقالے لکھے جا چکے ہیں، لیکن یہ بحث اب تک جاری ہے اور لوگ اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ مسعود صاحب کا یہ رسالہ الجھے ہوئے خیالات کو واضح کرنے اور زبان اور رسمِ خط کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

عموماً یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں موجودہ حالات کی تلخی لکھنے والے کے تصورات میں جذباتی ہیجان اور بیان میں غیر منطقی جوش نہ پیدا کردے۔ مسعود صاحب کا یہ رسالہ اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ اردو سے دل چسپی رکھنے اور اس کے مستقبل کو تابناک دیکھنے کی تمنا رکھنے والوں کے لیے اس رسالے کا مطالعہ ضروری بھی ہے اور یقیناً مفید بھی۔''(4)

عبدالماجد دریابادی نے اخبار صدق کی 8 مئی 1949 کی اشاعت میں کتاب کے

---

2 اردو زبان اور اس کا رسمِ خط۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ طبع دوم، کتاب نگر لکھنؤ 1961، ص 83

3 ایضاً، ص 86

4 ایضاً، ص 5

مشتملات کی اہمیت اور مندرجات کی معنویت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

> ''اردو کے خلاف جب سے یلغار شروع ہوئی ہے، چھوٹے بڑے متعدد رسالے اور مقالے اردو کی صحیح منزل اور مرتبے کی توضیح پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان سب میں بہت ہی ممتاز اور بہت ہی بلند درجہ اس رسالے کو حاصل ہے، جو اقامت میں کم تر اور مختصر اور 'قیمت' میں کہیں بہتر اور جامع ہے... حقیقت میں اپنے مبحث پر یہ ٹھوس، پرمغز اور اطراف و جوانب پر حاوی ایک مستقل تصنیف ہے اور مصنف کا کمال یہ ہے کہ ساری بحثوں کو 66 مختصر صفحات کے اندر سلیس و شگفتہ عبارت اور دل کش انداز میں سمیٹ لیا ہے۔
> ... ممکن ہو تو اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے بھی شائع کیے جائیں۔ غیر اردو دانوں میں آخر کچھ تو منصف مزاج اور تحقیق پسند ہوں گے۔ دشوار ہے کہ وہ اس کے دلائل سے غیر متاثر رہیں۔''[5]

فرہنگِ امثال

اس کتاب میں مسعود حسن رضوی نے عربی اور فارسی کی 1262 امثال کو ان کے ترجمے اور شرح کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ 199 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا 1937 میں دوسرا 1939 میں اور تیسرا 1958 میں۔ کتاب کی اہمیت و نوعیت اور اس کی غرضِ تصنیف کے بارے میں مولف نے دیباچے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''ایک مدت سے میرا قصد تھا کہ ان مثلوں کو جمع کر کے لغت کے طور پر ردیف وار ترتیب دوں اور ہر مثل کا بامحاورہ ترجمہ اور اگر ضرورت ہو تو شرح بھی لکھوں۔ اکثر مثلیں ایسی ہیں کہ ان کا صحیح استعمال سمجھنے کے لیے صرف ان کے معنی جان لینا کافی نہیں۔ اور بعض ایسی ہیں کہ اردو میں اپنے مفہوم کے خلاف معنی دیتی ہیں۔ اس لیے اس کی بھی ضرورت تھی کہ ترجمہ اور شرح دینے کے بعد یہ بھی بتایا جائے کہ ان کا استعمال کن موقعوں پر ہوتا ہے۔''[6]

---

5 اردو زبان اور اس کا رسمِ خط۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ طبعِ دوم، کتاب نگر لکھنؤ 1961، ص 5

6 فرہنگِ امثال۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر، لکھنؤ 1958، ص 3 (دیباچہ)

مسعود حسن کے خیال میں اب تک اس طرح کی کوئی فرہنگ مرتب نہیں کی گئی :

''فارسی و عربی امثال کے بعض چھوٹے چھوٹے مجموعے تو میری نظر سے گزرے ہیں مگر ان مجموعوں میں نہ امثال کی شرح کی گئی ہے نہ محلِ استعمال بتایا گیا ہے۔''(7)

مرتب نے اس مجموعۂ امثال میں انھیں مثلوں کو جمع کیا ہے جو اردو میں رائج ہیں :

''اس فرہنگ میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اس وجہ سے بہت سی مثلیں جو اردو میں رائج نہیں ہیں، چھوڑ دینا پڑیں۔ مگر باوجود اس شرط کے یہ غالباً فارسی مثلوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ عربی امثال بھی اس مجموعے میں شامل ہیں مگر صرف وہی جو اردو ادب کا جز بن چکے ہیں۔''(8)

نظامِ اردو

اصلاً سیّد انور حسین آرزو لکھنوی کی تصنیف ہے۔ مسعود حسن رضوی نے اس کتاب کے تعارف میں ایک دیباچہ لکھا ہے اور آرزو لکھنوی نے فصاحت و بلاغت کے جن اصولوں پر گفتگو کی ہے، ان کی مزید وضاحت کے لیے حواشی لکھے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کے ۳۳ نکات پر مشتمل اس کتاب کے تعارف میں آرزو لکھنوی لکھتے ہیں :

''یہ مختصر رسالہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں اردو زبان کے اجزائے ترکیبی کی تشریح و تقسیم کے بعد حدودِ زبان بیان ہوئے ہیں جس سے اردو کا ایک اصولی اور مستقل زبان ہونا واضح ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں استعمالِ الفاظ کے لیے وہ اصول وضع کیے گئے ہیں جن کے زیرِ اثر تمام الفاظ کے لیے عموماً اور مترادفات کے لیے خصوصاً محلِ استعمال مقرر ہو گئے ہیں۔''(9)

محشّی مسعود حسن رضوی کتاب کے بارے میں تعارفی کلمات میں کہتے ہیں:

''یہ چھوٹی سی چند صفحوں کی کتاب ہے مگر اس کی تصنیف میں مصنف کو اردو

---

7 فرہنگِ امثال۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر، لکھنؤ 1958، ص 3-4

8 ایضاً، ص 4

9 نظامِ اردو۔ سید انور حسین آرزو۔ مطبوعہ یوپی اردو اکادمی 1979، ص 9 (دیباچۂ مصنف)

زبان کی ساخت اور اس کے اسباب فصاحت پر برسوں غور کرنا پڑا ہے۔ بعض
لوگ اسے مبالغہ سمجھیں گے لیکن جو لوگ قاعدے بنانے کی دقتوں سے واقف
ہیں، انھیں اس کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔''(10)

مسعود حسن رضوی نے ایسے ایک قاعدے کے بنائے جانے میں درپیش دقتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پھر مصنفِ کتاب نے تو بیسیوں قاعدے بنا ڈالے ہیں۔ ان کی محنت کا
اندازہ کوئی کیا کرسکتا ہے۔ قاعدے بنانے کا ہفتخواں طے کرنے کے بعد جو
مصیبت ناک منزل سامنے آتی ہے وہ ان کا بیان کرنا ہے۔ اس کام میں بھی
بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ایک ایک لفظ تولنا ہوتا ہے، اصطلاحیں گڑھنا
پڑتی ہیں، لفظوں کا مفہوم معیّن کرنا ہوتا ہے۔ مصنف نے اس منزل کو بھی
نہایت خوبی سے طے کیا ہے اور ایسی ایسی مفید اصطلاحیں وضع کی ہیں کہ ان
سے قواعدِ زبان سکھانے، اصولِ فصاحت سمجھانے، اور عبارت کے حسن وقبح
بیان کرنے میں آئندہ بہت آسانی ہوا کرے گی۔''(11)

مباحث کی ترتیب اور منتشر مطالب کی تنظیم میں جو مشکلیں آتی ہیں، محشی نے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور اپنے حواشی کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مصنف نے اس کتاب میں انتہا کا اختصار ملحوظ رکھا ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ اختصار عبارت کی بہت بڑی خوبی ہے مگر اس سے بعض اوقات مطلب
سمجھنے میں دقت پڑتی ہے، اس لیے میں نے حضرت مصنف کی اجازت سے
اس کتاب پر کہیں کہیں توضیحی حاشیے لکھ دیے ہیں، افسوس ہے کہ یہ حاشیے عدیم
الفرصتی کی وجہ سے جیسے ہونا چاہیے تھے ویسے نہیں ہیں، پھر بھی امید ہے کہ ان
سے مصنف کا مطلب سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی۔''(12)

کتاب کی اہمیت واولیت کا اعتراف کرتے ہوئے مسعود حسن اس میں غلطیوں کے امکان کو مسترد نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

---

10 نظامِ اردو۔ سید انور حسین آرزو۔ مطبوعہ یوپی اردو اکادمی 1979، ص 18

11 ایضاً، ص 19-18

12 ایضاً، ص 21-20

''یہ موضوع بالکل نیا ہے۔ سب سے پہلے مصنف نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔ اس لیے غلطیوں کا امکان کیا یقین ہے۔ اہلِ نظر کلیات میں مستثنیات نکال کے انھیں زیادہ مستحکم کریں گے، ان کے بیان کے لیے بہتر الفاظ تلاش کریں گے، ان کی ترتیب بدلیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا مگر اوّلیت کا فخر اور رہنمائی کا شرف مصنف ہی کو حاصل رہے گا۔''(13)

13 نظامِ اردو۔ سید انور حسین آرزو۔ مطبوعہ یوپی اردو اکادمی 1979، ص 20-19

تراجم

مسعود حسن رضوی ایک کامیاب مترجم بھی ہیں۔ اگر چہ انھوں نے بہت زیادہ ترجمے نہیں کیے ہیں لیکن جو ترجمے کیے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترجمے کے فن سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی باریکیوں کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اصل زبان میں بیان کیے ہوئے مفہوم کو اسی احساس و تاثر کے ساتھ اپنی زبان میں کس طرح منتقل کیا جاسکتا ہے۔

ایک کامیاب مترجم کے لیے مترجم کا دونوں زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے بلکہ اصل زبان کے مزاج سے واقف ہونا زیادہ ضروری ہے۔ تبھی مترجم اصل مصنف کے مافی الضمیر کو اپنی زبان میں منتقل کرسکتا ہے۔ مسعود حسن اصل زبان میں بیان کیے ہوئے معنی و مفہوم کو مجروح کیے بغیر اسے اپنی زبان میں منتقل کرسکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ترجمہ لفظاً اور معناً اصل سے کس طرح قریب رہ سکتا ہے۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ پر 16 ستمبر 1962 کو 'ایک ادبی ملاقات' کے ماتحت مسعود حسن نے ترجمے کے ضمن میں ہاشمی صاحب کے بعض سوالوں کے جواب میں ترجمے کے ان پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ ہاشمی صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ ترجمہ لفظی ہونا چاہیے یا آزاد، مسعود حسن کا کہنا تھا کہ ترجمہ لفظی بھی ہوتا ہے اور آزاد بھی۔ اور جب ہاشمی صاحب نے استفسار کیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے تو مسعود حسن نے جواب میں کہا:

''انگریزی کا ایک جملہ ہے:

"The carpets in that room. were more grand than artistic"

اپنے زمانے کے ایک معروف و مقبول ادیب نے اس جملے کا ترجمہ یوں کیا تھا: 'اس کمرے کے مفروشات بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے زیادہ محتشم

تھے۔'' میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں: ''اس کمرے کے فرش فروش جتنے پرکار تھے اس سے زیادہ شاندار تھے۔'' یہ اس جملے کا لفظی اور آزاد ترجمہ ہے۔ لفظی اس معنی میں کہ ہر لفظ کا مفہوم ترجمے میں موجود ہے اور آزاد اس لیے کہ لفظوں کے استعمال اور جملے کی ساخت میں انگریزی کی تقلید نہیں کی گئی ہے۔''[1]

اس مثال سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مسعود حسن رضوی کامیاب ترجمے کے فن سے کس حد تک واقف تھے۔ ذیل میں ان کی ترجمہ کی ہوئی دو کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ پہلی کتاب ہے:

امتحانِ وفا

محولہ بالا ریڈیائی گفتگو میں ہاشمی صاحب نے مسعود حسن رضوی سے یہ بھی پوچھا کہ آپ کا سب سے پہلا ادبی کارنامہ کون سا ہے تو انھوں نے کہا:

''آج سے 44 سال پہلے 1918 میں میں نے انگلستان کے ملک الشعرا ٹینی سن کے ایک منظوم افسانے 'اینک آرڈن' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو 1920 میں 'امتحانِ وفا' کے نام سے شائع ہوا۔ میری ادبی زندگی اسی ترجمے سے شروع ہوئی۔''[2]

اس طرح 'امتحانِ وفا' مسعود حسن رضوی کی پہلی تصنیف ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک اہم کلاسیکی فن پارے کے ترجمے سے کیا۔ 57 صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ 1920 میں یونانی دواخانہ پریس، الٰہ آباد سے شائع ہوا۔

ایک لڑکی سے دو لڑکوں کی بے غرض اور معصومانہ محبت کی یہ داستان 21 فصلوں میں بیان کی گئی ہے۔ کہانی کی مختلف صورتوں کی وضاحت کے لیے مناسبِ حال شعروں کا بھی سہارا لیا گیا ہے اور کہانی کے اختتام کو بائیسویں فصل قرار دے کر صرف یہ شعر لکھ دیا گیا ہے:

نیرنگِ حسن و عشق کی وہ آخری بہار　　　تربت تھی میری اور کوئی اشکبار تھا

---

1 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے، ڈاکٹر طاہر تونسوی مجلسِ ترقی ادب لاہور، 1989 ص 286

2 ایضاً، ص 285

کتاب کے دوسرے صفحے پر 'معذرت' کے نام سے لکھی ہوئی عبارت میں مسعود حسن نے ٹینی سن کے سے ماہرِ لفظ و معنی کے اس منظوم افسانے کو اردو میں ڈھالتے وقت اپنی عاجزی کا اظہار کیا ہے لیکن یہ بھی کہا ہے ''مگر کیا عجب کہ ادبی جواہر کے پرکھنے والوں کو کہیں کہیں اس کی اصلی چمک دمک نظر آجائے۔''

'گزارش' میں وہ لفظی ترجمے کی خواہش اور سادگیِ زبان کے خیال کو قلم کی زنجیریں قرار دیتے ہوئے انھیں اپنے قلم کی طاقتِ رفتار کی آزمائش سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ مصنف نے قصے کو بیان کرنے میں اسلوب اور تکنیک کے کیا کیا کمال دکھائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''اس افسانے کے صرف واقعات ہی توجہ کے مستحق نہیں ہیں۔ الفاظ پر بھی خاص طور پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ مصنف کبھی بعض الفاظ کی تکرار سے کوئی گذشتہ واقعہ یا منظر پیشِ نظر کرنا چاہتا ہے کبھی ایک جملہ دوبار لکھ کر پوری تقریر یاد دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس قصے میں ایسے موقعے بھی ہیں کہ جو کچھ منہ سے نکل گیا ہے وہی ہوا بھی۔ مگر باکمال افسانہ نویس ناظرین کو ادھر متوجہ نہیں کرتا، چپکے سے آگے بڑھ جاتا ہے اور اس طرح وہ زبانِ خاموشی سے گویا یہ کہتا ہے کہ جو بات بعد کو پیش گوئی نکلی وہ بالا ارادہ نہیں کہی گئی تھی۔ اثنائے گفتگو میں بلا قصد زبان پر آگئی تھی۔''(3)

یہ عبارت بتاتی ہے کہ مسعود حسن ترجمے کے فن کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسی کے رموز سے بھی واقف تھے۔

دیباچے میں مترجم نے ٹینی سن کی شاعری، اس افسانے کی خصوصیتوں، افسانے کے اشخاص اور قصے کے اخلاقی اثر کے بارے میں مختصراً اظہارِ خیال کیا ہے اور مصنف کے طرزِ نگارش کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ٹینی سن نے واقعات کے بیان میں انتہا کا اختصار ملحوظ رکھا ہے۔ تھوڑی عبارت میں بہت مطلب ادا کرنا یوں تو ہمیشہ مشکل ہے مگر حیرت تو جب ہوتی ہے کہ اختصار میں تفصیل سے زیادہ وضاحت ہو اور یہی حیرت خیز اختصار اس

---

3 امتحانِ وفا۔ مترجم مسعود حسن رضوی ادیب، یونانی دوا خانہ پریس الہ آباد 1920، ص 2 (دیباچہ)

افسانے کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ نہ کوئی طولانی مکالمہ ہے نہ کسی واقعے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش ہے۔"(4)

یہاں مسعود حسن کے اس ترجمے کا ایک نمونہ پیش کیا جارہا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ انھیں اصل زبان کے مفہوم کو سمجھنے اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرنے میں کتنی مہارت تھی۔

Heard and not heard him, as the village girl, who sets her pitcher underneath the Musing on him that used to fill it for her, Hears and not hears, and lets it overflow.

ترجمہ: "جس طرح ایک دیہاتی لڑکی اپنا گھڑا چشمے کے نیچے رکھ کر اس شخص کے خیال میں غرق ہوجاتی ہے، جو اس کے بجائے پانی بھردیا کرتا تھا۔ وہ گھڑے میں پانی گرنے کی آواز سنتی ہے مگر اس طرح گویا نہیں سنتی۔ گھڑا بھر کر ابل نکلتا ہے اور اسے خبر نہیں ہوتی۔"(5)

قواعدِ کلیّہ بھاکھا

(شمالی ہند کی قدیم ترین اردو گرامر)

چالیس صفحات پر مشتمل یہ مختصر سی کتاب مرزا خان ابنِ فخرالدین محمد کی اس فارسی کتاب کا ترجمہ ہے جو تحفۃ الہند کے نام سے عہدِ عالم گیر میں شہنشاہ کے مطالعے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب پر پروفیسر مسعود حسن رضوی کا ایک تعارفی مضمون رسالہ 'ادب' لکھنؤ میں جون 1930 میں شائع ہوا تھا۔ اور انگریزی زبان میں ایک اور مضمون الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت گنگا ناتھ جھا کو پیش کی جانے والی یادگاری کتاب میں شامل کرنے کے لیے 1933 میں لکھا گیا۔

مسعود حسن نے اس کتاب کا ترجمہ 1944 میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ 1955 میں 'رسالہ نقوش'، لاہور کے خاص نمبر میں اور دوبارہ 1960 میں اسی رسالے کے 'ادبِ عالیہ' نمبر میں 'برج بھاشا کی پہلی گرامر' کے عنوان سے شائع ہوا۔ پھر 1968 میں اسے نظامی پریس، لکھنؤ

---

4 امتحانِ وفا۔ مترجم مسعود حسن رضوی ادیب، یونانی دوا خانہ پریس الہ آباد 1920، ص 2-3 (دیباچہ)

5 ایضاً، ص 13-14

سے ایک مختصر مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا۔

سات صفحے کے اپنے تعارفی مقدمے میں مسعود حسن نے کتاب کی غرض و غایت، اس کے مختلف نسخوں، نسخوں کے دیباچوں کے اختلافات، کتاب کے مقدمے کے مشتملات اور کتاب کے متن کی صورت و نوعیت کے بارے میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ دوسرے نسخوں کے دیباچوں کو دلیلوں سے غلط ٹھہرا کر مسعود حسن رضوی نے اپنے پاس موجود نسخے کو معتبر جانا ہے اور اشاعت کے لیے اسی نسخے کا انتخاب کیا ہے۔ انھوں نے ہندی کے مستند عالموں سے رجوع کرنے کے بعد مصنف کے اس دعوے کو صحیح بتایا ہے کہ یہ برج بھاشا کی پہلی گرامر ہے۔ مقدمۂ کتاب میں وہ اصل کتاب کا تعارف کراتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک مقدمہ سات باب کا اور ایک خاتمۂ کتاب ہے۔ مقدمۂ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ناگری حروف اور رسمِ خط کا تفصیلی بیان ہے اور دوسرے میں بھاکھا کے قواعدِ کلّیہ ہیں۔ ابواب کی تفصیل اس طرح ہے: پہلے باب میں 'پنگل' یعنی علمِ عروض، دوسرے باب میں 'تُک' یعنی علمِ قافیہ، تیسرے باب میں 'النکار' یعنی علمِ بیان و بدیع چوتھے باب میں 'سنگار رس'، پانچویں میں 'سنگیت'، چھٹے میں 'کوک' یعنی عورت و مرد کے اقسام اور عورتوں کے ساتھ معاشرت و مباشرت اور ساتویں باب میں 'مادریک' یعنی علمِ قافیہ کا بیان ہے۔ خاتمۂ کتاب میں برج بھاشا کی قدیم ترین فرہنگ ہے جس میں کم و بیش تین ہزار ہندی لفظوں کے تلفظ اور معنی فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

مسعود حسن رضوی نے اپنے مقدمے کے آخر میں لکھا ہے:

> ''اگرچہ یہ گرامر کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے، پھر بھی تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور اردو کے بارے میں لسانی تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے۔''(6)

---

6 قواعدِ کلّیہ بھاکھا۔ مترجمہ۔ مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس لکھنؤ 1968، ص 10-9

دیباچے، تبصرے، مکاتیب

مسعود حسن رضوی نے دیباچے اور تبصرے بہت زیادہ نہیں لکھے۔ اس سلسلے میں ان کا رویہ بہت محتاط تھا۔ اوّل تو اپنے مستقل تصنیفی کاموں سے ان کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا۔ دوسرے یہ کہ بہت کم تحریریں ان کے معیار پر پوری اترتی تھیں۔ ان کے ادبی قدوقامت کی وجہ سے ان کے زمانے کے ادیب اپنی تصنیفوں پر ان سے چند سطریں لکھوانے کے متمنی رہتے لیکن وہ عموماً انکار کردیا کرتے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کوئی مروت روا نہیں رکھی۔ تاہم چند کتابیں ایسی ہیں جن کی ادبی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے چند سطریں لکھنا ضروری سمجھا۔ ان کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

(1) عروجِ سخن : (مجموعۂ مراثی) دولہا صاحب عروج (مقدمہ)
(2) امیر مینائی : شاہ محمد ممتاز علی آہ (پیش لفظ)
(3) گلستانِ سعید : چوہدری سید احمد عباس زیدی (تعارف)
(4) افسانہ نگاری : سید وقار عظیم (تعارف)

عروجِ سخن میں مسعود حسن نے عروج کے حالاتِ زندگی لکھنے کے ساتھ ان کے مرثیوں پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔

وقار عظیم کی کتاب افسانہ نگاری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ امر میری مسرت میں اور اضافہ کررہا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک ہونہار مصنف کی پہلی تصنیف ہی نہیں ہے بلکہ اپنے موضوع پر اردو میں پہلی جامع تصنیف بھی ہے۔''(1)

---

1 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے، ڈاکٹر طاہر تونسوی، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، 1989، ص 250

ڈاکٹر صفدر آہ کی تالیف 'میر اور میریات' کے فلیپ پر مسعود حسن رضوی نے ان چند سطروں میں کتاب کی پذیرائی کی:

"آپ کی تصنیفِ لطیف 'میر اور میریات' عمیق و مدید غور وفکر کا ثمرہ اور تحقیق وتنقید کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ آپ نے میر کے حالاتِ زندگی میں ان کے زمانۂ وقوع پر نظر کرکے بہت سی نئی اور مستند معلومات فراہم کر دی ہیں۔ یہ چند سطریں نہ تبصرہ ہیں نہ تنقید۔ یہ صرف اس بصیرت ومسرت کا بے ساختہ اظہار ہیں جو کتاب کے مطالعے سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔"[2]

دیباچوں کی طرح تبصرے لکھنے میں بھی مسعود حسن آسانی سے اپنا قلم نہیں اٹھاتے تھے۔ اپنی طویل ادبی زندگی میں انھوں نے اکتالیس کتابوں پر تبصرے لکھے جن میں سے بیشتر آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ سے نشر ہوئے۔ ان تبصروں میں مسعود حسن نے ادبی دیانتداری کے ساتھ کتابوں کے موضوعات و مشتملات کا جائزہ لیا اور ان کی صحیح قدر وقیمت سے متعارف کرایا۔ یہاں چند مشہور کتابوں پر ان کے تبصروں کے منتخب اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی کی کتاب 'دکن میں اردو' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"کتاب کے اس خلاصے سے بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ مولف نے اس کی تالیف میں کس قدر محنت کی ہے۔ اب میں چند نقائص کی طرف قابل مولف کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو کتاب کی رفعت اور بڑھ جاتی... مولف نے دکنی اور مدراسی شاعروں کا جو کلام انتخاب کیا ہے، وہ اکثر قابلِ اعتراض ہے... شاعروں کے کلام کے بارے میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ بھی اکثر قابلِ تسلیم نہیں... دکن کے قدیم شعرا کا ذکر نہیں۔ متاخرین کا کلام بھی زبان اور محاورے کی غلطیوں سے مملو ہے۔ خود مولفِ کتاب کی عبارت بھی اس عیب سے پاک نہیں۔"[3]

---

2 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے، ڈاکٹر طاہر تونسوی، مجلسِ ترقی ادب، لاہور 1989، ص 252

3 ایضاً، ص 257

کلیم الدین احمد کی بحث انگیز کتاب 'اردو شاعری پر ایک نظر' کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اس کے مطالعے سے مصنف کی غیر معمولی جرأت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ رو رعایت سے کام نہیں لیتے، بے لاگ تنقید کرتے ہیں، کسی کی شہرت اور مقبولیت سے مرعوب نہیں ہوتے اور کسی کے عیب بیان کرنے میں نہیں جھجکتے۔ لیکن جب نظموں کے اس مجموعے پر نظر کرنے بیٹھتے ہیں جو 'گلِ نغمہ' [کلیم الدین احمد کے والد عظیم الدین احمد کا شعری مجموعہ] کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے تو ان کا قلم تنقید چھوڑ کر تقریظ پر اتر آتا ہے۔ ان کا لب ولہجہ بدل جاتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں: ''یہ نظم اعلیٰ پیانے کی شاعری کا بے مثال نمونہ ہے۔'' کبھی کہتے ہیں ''ہر نظم میں نئی شان ہے، ہر نظم کا نیا ڈھنگ اور ہر نظم بے مثال ہے۔'' اور تبصرہ اس جملے پر ختم کرتے ہیں۔ ''یہ نظمیں ظاہری اور باطنی حسن کی نایاب مثالیں ہیں۔''[4]

تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کے ساتھ ساتھ مسعود حسن نے تخلیقی تصانیف پر بھی اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ علی عباس حسینی کے مجموعے 'باسی پھول' کا احاطہ ان الفاظ میں کیا ہے :

''پریم چند کے بعد سے یہ کہنا ذرا مشکل ہوگیا ہے کہ ہندستان کا بہترین افسانہ نگار کون ہے۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حسینی صاحب آج کل کے بہترین افسانہ لکھنے والوں میں ہیں... اس مجموعے میں حسینی صاحب کے پرانے اور نئے افسانے شامل کر دیے گئے ہیں اور یہ نہیں بتایا گیا کہ کون افسانہ کب لکھا گیا تھا۔ اس کمی کی وجہ سے پڑھنے والے ان تدریجی تبدیلیوں کا اندازہ نہ کر سکیں گے جو ان کے نقطۂ نظر اور اندازِ بیان میں ہوتی رہی ہیں۔''[5]

اس طرح مسعود حسن رضوی نے دیباچوں اور تبصروں میں بے جا تحسین و توصیف کے بجائے ایک سچے اور کھرے نقاد کی حیثیت سے کتابوں کے مباحث کا جائزہ لیا اور ان کی اصل نوعیت و ماہیت سے متعارف کرایا۔

---

4 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے، ڈاکٹر طاہر تونسوی، مجلسِ ترقی ادب، لاہور 1989، ص 259

5 ایضاً، ص 262

مکتوب نگاری

مکتوب نگاری نے کم و بیش ہر زبان میں ادبی اور تخلیقی صنف کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ جب کوئی ادیب یا تخلیقی فنکار خط لکھتا ہے تو عام لکھنے والے کے برعکس اس کے خطوں میں ادبی اور تخلیقی عناصر کا موجود ہونا فطری امر ہے کیونکہ اپنی دوسری تحریروں کی طرح خطوں میں بھی وہ اپنی ادبی اور تخلیقی شخصیت کا انکشاف کرتا ہے۔ اس شخصیت کے انکشاف کے ساتھ ساتھ اس کے خطوں میں اس کا زمانہ اور ماحول بھی بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتوب نگاری نے ہر زبان میں ایک اہم ادبی اور تاریخی سرمائے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

ایک ادیب عام طور پر دو طرح کے خطوط لکھتا ہے۔ ایک وہ جن میں وہ اپنی محبوب ترین شخصیتوں سے ہمکلام ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن میں وہ دوسروں سے ادبی استفسار کرتا ہے یا دوسروں کے ادبی استفسار کے جواب دیتا ہے۔ مسعود حسن رضوی نے دونوں طرح کے خطوط لکھے ہیں۔ لیکن نجی خطوط کے مقابلے میں ادبی معاملات و مسائل سے متعلق ان کے خطوط کی تعداد زیادہ ہے اور ان خطوط کے مخاطبین میں ہر طرح کے افراد موجود ہیں۔

خطوط نگاری میں خط کے متن، اسلوبِ نگارش اور تحریر کی بناوٹ سے لکھنے والے کے ذہن و مزاج کے بارے میں بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ مختارالدین احمد مسعود حسن کی مکتوب نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”آپ کی ان سے صرف خط و کتابت رہی ہے، تو ان کی تحریر کی ہر سطر سے نفاست پسندی کی جھلک آپ کو ملی ہوگی۔ خط کا کاغذ صاف ستھرا ہوگا ... روشنائی اچھی ہوگی۔ قلم کی نب درست حالت میں ہوگی اور حرف ایسے خوبصورت اور واضح ہوں گے کہ آپ کو ان پر آفسٹ طباعت کا شبہ ہو۔ مختصر تحریروں میں اور چھوٹے موٹے رقعوں میں اکثر لوگ ہاتھ روک کر لکھ لیتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے کئی کئی ورق کے خط اور مضمون دیکھے ہیں جن کی سطریں بالکل سیدھی ہیں اور خط کا انداز شروع سے آخر تک بالکل یکساں ہے۔“[6]

6 مسعود حسن رضوی ادیب۔ ذات وصفات، مرتبہ مالک رام، ص 89

سوانح کے باب میں ہم مسعود حسن کی شخصیت کی نفاست کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ یہی نفاست ان کے خطوں میں بھی نظر آتی ہے۔ گویا مسعود حسن کے خطوط ان کی شخصیت کی نفاست کی دلیل ہیں :

اپنے متعلقین کے لیے مسعود حسن کی فکرمندیاں اور ان کا باطنی اضطراب ان کے نجی خطوں میں کھل کر ظاہر ہوا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام 17 دسمبر 1947 کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''میری بہن جو فسادات کے زمانے میں لدھیانہ کے مقتل میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ لاہور پہنچ گئی تھیں اور اس شہر کو دارالامن سمجھ رہی تھیں، ان کا سترہ برس کا ہونہار لڑکا جو ہیلی کالج آف کامرس میں پڑھ رہا تھا، قتل کر ڈالا گیا۔ ہم سب لوگ اس مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کا بڑا بھائی بھی چند سال ہوئے ایک اتفاقی حادثے سے یکا یک اپنی دائمی مفارقت کا داغ دے گیا تھا۔ اب اس کی ناگہانی موت سے تو دل پر ایسا زخم لگا ہے کہ جو کبھی مندمل نہ ہوگا۔''(7)

ادبی استفسار سے متعلق خطوں میں مسعود حسن کی وسعتِ علم، باریک بینی اور محققانہ عرق ریزی کا مظاہرہ ان کے اِن جوابوں میں دیکھیے۔ 6 اگست 1967 کے ایک خط میں ڈاکٹر صفدر آہ کو لکھتے ہیں :

> ''آپ کے استفسار کے جواب میں تحریر ہے کہ شیخ علی حزیں کا سالِ وفات جو براؤن نے لکھا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں حزیں کی تاریخِ وفات شب یازدہم جمادی الاول 1180ھ لکھی ہے جو 15 اکتوبر 1866 کے مطابق ہے۔ اسی تاریخ کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ آزاد نے حزیں کا سالِ وفات اس مصرعے سے نکالا ہے :
>
> ع از فوتِ حزیں، حزیں دلِ ماست''(8)

ڈاکٹر سلام سندیلوی کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں :

---

7 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص 269

8 ایضاً، ص 271

''فضلی کی کتاب کا اصل نام 'کربل کتھا' ہے۔ یہ کتاب ملاّ حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا ملخص ترجمہ ہے...ہماری اس وقت تک کی معلومات کے لحاظ سے 'کربل کتھا' شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو محمد شاہ کے عہدِ حکومت میں لکھی گئی۔''

اسی طرح کسریٰ منہاس کے ایک استفسار کے جواب میں رقم طراز ہیں:

''تحریر الشہادتین کا سنہِ طباعت 1208ھ نہیں ہوسکتا شاید 1308ھ ہو، ہندسوں کو لکھنے میں اکثر غلطی ہوجاتی ہے بہرحال بغیر کتاب کو دیکھے ہوئے کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ طوطی نامہ کلیاتِ میر جعفر میں شامل ہے۔ ایک مشہور روایت کے مطابق میر جعفر کا انتقال فرخ سیر کی تخت نشینی کے سال یعنی 1314ھ (1712) میں ہوا۔''(9)

ادبی معاملات ومسائل سے متعلق دوسروں کو اطلاعات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ مسعود حسن خود بھی اپنے زیرِ تصنیف کاموں سے متعلق دوسروں سے ضروری تفصیلات معلوم کرتے۔ یکم جنوری 1968 کے ایک خط میں مشفق خواجہ کو لکھتے ہیں:

''فہرستِ مخطوطات صفحہ نمبر 81 و 704 تاریخِ سلطانِ عالم واجد علی شاہ مصنفہ گنگارام اور صفحہ نمبر 100، 906، 907، 908 تاریخ کندن لال مصنفہ کندن لال اشکی، ان دو مخطوطوں کے بارے میں ضروری تفصیلات معلوم کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ براہِ کرم زحمت کرکے لکھ بھیجیے۔''(10)

خطوں کے ان اقتباسات میں مسعود حسن کی شخصیت کی مختلف پرتیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے متعلقین پر ٹوٹنے والی مصیبتوں کا شدید اثر قبول کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں ان کی ذات غم و اندوہ کا مرقع معلوم ہونے لگتی ہے دوسری طرف ان خطوں سے ادبی معاملات میں ان کی وسعتِ علم اور نظر کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ خطوط مسعود حسن کی ظاہری اور باطنی شخصیت کا شفاف آئینہ ہیں۔

---

9 مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص 272

10 ایضاً، ص 274